اسلامی
نظریۂ اجتماع
حمید زماں صدیقی
نفیس اکیڈمی
عابد روڈ
حیدرآباد دکن

اسلامی نظریۂ اجتماع

از

جناب حیدر زماں صدیقی

نفیس اکیڈمی

حیدر آباد (دکن)

قیمت: تین روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ

قیمت: دو روپے بارہ آنے کلدار

طبع اوّل ——————— ایک ہزار

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

مطبوعہ
رزاقی پریس، انتظامی پریس
شفیق مشین پریس حیدرآباد (دکن)

(مکتبۂ محمود اختر)

فہرست

۹ اسلامی اجتماع و تمدن کے چند اہم اجزاء

اسلام کا جہاد ملّی

تنظیم ملّی کی اساس

اسلام کا تصوّر آزادی

غیر مسلموں کا مفہوم آزادی

مسلمانوں کی آزادی

استقلالِ مرکز

دائرۂ اطاعت

ذہنی تربیت

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

صبح ازل میں جس طرح مادۂ عالم تکوین کی منازل سے گذر رہا تھا۔ اور شمس و قمر وجود میں آرہے تھے بالکل اسی طرح دنیا ذہنی و فکری حیثیت سے اس وقت تکوین و تعمیر کے منازل سے گزر رہی ہے، ایک انتشار ہے دماغوں اور ذہنوں میں بہت سی بنیادیں جو کافرانہ تصورات کے ساتھ قائم کی گئی تھیں پچھلے چار سو برس میں تجربہ نے انھیں ناقص قرار دیا۔ اور قومیت کے ناکافی اور مضر ہونے کا اعلان ان کی طرف سے ہو رہا ہے جو کبھی اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

ہندوستان کے برہمن کدے میں جہاں نظر کی وسعت گنگا اور جمنا کی مقدس وادیوں سے آگے نہیں بڑھتی، ایک عزم پیدا ہوا، اور اس نے قائداعظم کی انتھک کوششوں سے میثاق کی شکل اختیار کی، بہار، پنجاب، اور بنگال وغیرہ نے بڑھکر خون کی مہریں اس میثاق پر لگادیں اور شب یلدائے ہندوستان سے آفتاب پاکستان چمک اٹھا،

اس وقت ضرورت ہے کہ انسانوں کو گمراہی کے مہیب غار سے بچایا جائے اور اس کی پیشانی عظمت و جلال کو اصنام نسل و وطن کے آگے جھکنے سے محفوظ رکھا جائے۔

یہ بڑا کام ہوگا اور جسے اس کی سعادت نصیب ہو وہ خوش قسمت ہے وطن کی دیوی جس طرح دہلی میں جمنا پر کھڑی ہنس رہی ہے پاکستان میں بھی اس کی مسکراہٹ کم نہیں ہے۔ ارباب نظر و بصیرت صورت حال کو وحشت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

ہم نے انسانی ذہن و دماغ کی صحیح تربیت کے لئے اپنی بساط بھر کوششیں کی ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ کوششیں جاری رہیں گی ہم نے اس سلسلہ میں حکومت الہیہ، اسلام کا نظام حیات، اسلام کا نظام عدالت و سیاست، اسلام اور سود، اسلام کے سیاسی تصورات تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ، تاجدار دو عالم، داستان کربلا شائع کی ہیں، مولانا حیدر زمان صدیقی کی زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور انشاء اللہ ہم آئندہ اس موضوع پر اسی مقدس مقصد کے لئے حسب ذیل کتابیں عنقریب پیش کریں گے۔

اسلامی نظریۂ معشیت، عالمگیر اسلامی تصورات، اسلامی دستور حکومت و سیاست، فلسفہ احکام شریعت، ترجمۂ اردو حجۃ اللہ البالغہ، حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، اسلام کا تصور قیامت، اسلام کا تصور جہاد، عالمگیر اسلامی خطبات

مکاتیب حضرت امام غزالیؒ وغیرہ وغیرہ

جس سے جتنا ہو سکے اس مقصد کے لئے کام کرے۔ آج اگر ذہن انسانی کی صحیح تربیت نہیں کی گئی تو صدیوں کے لئے مایوسی ہو جائے گی، ہم کو خدا کے فضل سے یہ سعادت حاصل ہے کہ ہم یہ کام کر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت کا مرتبہ عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجتماعی اعمال کی بنیاد

علامہ سید عبد القدوس ہاشمی

ہمہ گیر مذہب

مذہب اگر واقعی مذہب ہے تو ضروری ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کے لئے ہدایات اور ضوابط موجود ہوں، ورنہ حیات انسانی کی آرائش اور روح انسانی کی سکینت کا سامان اس سے مفقود ہوگا، مذہب کہیں تو رہنمائی کرے گا اور کہیں اپنے پیروں کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے گا۔

خیال تو فرمایئے وہ بھی کوئی مذہب ہوا جس میں خالق و مخلوق کے رشتے تو بتا دیئے جائیں مگر یہ نہ بتایا جائے کہ مخلوق اور مخلوق میں باہمی تعلق کیا ہو۔ اور چھوڑ دیا جائے زندگی کے اتنے بڑے معاملہ کو رسوا و رسوکن کے عقلی گدوں اور سرتی وسمرتی کے افسانوں کے لئے۔ ایسا طریقہ یا مسلک حقیقۃً کوئی مذہب نہیں بلکہ مذہب کی نقالی ہے

ذرا غور تو فرمایئے! آپ کو کس کس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کسی ضابطہ

کی ؟ جہاں آپ کو اپنے خالق کی یاد اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ہادی برحق کی جو آپ کو بتائے کہ پیدا کرنے والے خالق کو خوش کرنے اور اس کی خوشنودی سے اپنی اُخروی زندگی یا حیات مابعد الممات کو خوش گوار بنانے کا یہ طریقہ ہے، وہیں آپ اس کی بھی تو ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے تعلقات دوسرے انسانوں سے کیا ہوں، اور کس طرح ان تعلقات کو بہتر رکھ کر آپ اپنی اُخروی زندگی کے لئے اس سے سرمایہ سکون و اطمینان حاصل کریں۔ اگر کوئی مذہب یہ نہ بتائے کہ آپ کے تعلقات پڑوسی سے کیا ہوں، محلہ والوں سے کیا ہوں، شہر والوں سے کیا ہوں، اور خود اپنے خاندان والوں سے کیا ہوں تو یہ مذہب بے عمل صحرانشین سادھوں کے کام کا تو ہو سکتا ہے، لیکن ایک عملی انسان کو اس سے کیا ملے گا اور کون انسان ہوگا جس کے قلب کو ایسے مذہب سے اطمینان و سکون حاصل ہو سکے گا۔

دنیا میں ہمیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ انسان اپنی طفلی کے ابتدائی دور میں بھی اپنی مرضعہ اور اپنی ماں سے مانوس ہوتا ہے، اس کے بعد اپنے بھائی بہنوں سے، اور پھر ہم عمر، اور ہمجنسوں سے مانوس ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ آدمی مہد سے لحد تک اجتماعی زندگی ہی بسر کرتا ہے۔ اب اگر مذہب ان مراحل پر اس کی رہنمائی نہ کرے تو کون ہے جو ان اجتماعی تعلقات کی ضابطہ بندی کرے گا۔ اور اگر بفرض محال کوئی دانشمند ضابطہ بندی کر بھی دے تو پھر کون ذمہ دار ہے ان ضابطوں کی صحت اور ان کے مفید ہونے کا۔ تجربہ اگرچہ بہت کچھ بتا دے پھر بھی حیات مابعد الممات پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، اس کو قبر سے نکل کر کون تجربہ کار

تبلائے گا۔؟

انسان مدنی بالطبع ہے وہ باہمدگر مل جل کر ہی زندگی بسر کرنے میں لطف اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اکیلا انسان نہ ہنستا بھلا' نہ روتا بھلا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی کثرت ایک وحدت مشترک میں گم ہو کر معاشرہ بناتی ہے اور معاشرے اپنی وسعت و ترقی میں ملّت و قوم بن جاتے ہیں۔

افراد کی انفرادی زندگی میں جہاں ایک نظم و ضبط ضروری ہے وہاں اس کی معاشرتی و ملّی زندگی میں بھی ایک ضابطہ اور بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لئے اللہ کے مذہب میں جو حقیقتہً ایک ہی مذہب ہے اور جس کے علاوہ سارے مذاہب کہلانے والے طریقے حقیقتہً نامکمل ڈھانچے یا مذہب کی نامکمل نقالی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ جہاں انسان کی انفرادی و عائلی زندگی کے لئے بنیادیں بتائی گئی ہیں' وہاں اس کی ملّی و اجتماعی زندگی کے لئے بھی بنیاد اور اس میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط بنا دیئے گئے ہیں یہ مذہب اسلام ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام اور دین و مذہب تو صرف یہی ہے۔ اس سے پہلے کے تمام مذاہب اس کی تمہیدیں تھیں' اور بعد کے مذاہب اسی کی دھندلی سی پرچھائیاں ہیں' جو ناقص بھی ہیں اور مشتبہ بھی۔

یقین و عمل

اسلام نے انسان کے یقین اور اس کے اعمال کی بنیاد رکھی ہے اس ناقابل انکار حقیقت پر کہ انسان خود بخود پیدا نہیں ہو گیا ہے بلکہ کسی ذی شعور و صاحب ادراک ہستی برتر نے اُسے پیدا کیا ہے

اور اس لئے انسانی اعمال و افکار محض اس کی رضا و اطاعت کے لئے ہونا ضروری ہے۔ انسان کی زندگی، انفرادی، عائلی، اور اجتماعی تمام تر اسی مقصد و اصول کے ماتحت ہو تو صحیح ہے ورنہ غلط اور تمام تر غلط؛

ان صلوٰتی ونسکی ومحیائی ومماتی للہ رب العلمین

انسان بولے تو اس کے لئے، اور چپ رہے تو اس کے لئے۔ شادی کرے۔ بچوں سے محبت کرے، پڑوسیوں کی امداد کرے یا ملی و قومی فرائض کو ادا کرے تمام تر اسی مقصد و اسی منشار کے لئے۔

انسان اپنے اس ابتدائی دور سے جب کہ پہاڑوں کے غار اس کی آرام گاہیں تھیں اور جنگل کے پھل اور شکار اس کی غذائیں، اس دور تک جب کہ تہذیب و تمدن کی فراوانی یتطاولون فی البنیان کا منظر پیش کر رہی ہے، اور تکلفات و تصنعات کی بہتات نے الھٰکم التکاثر میں اسے مبتلا کر دیا ہے، انسان انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف کیوں راغب ہے، کیا صرف اس لئے کہ کچھ ایسے اہم امور کی تکمیل کے لئے جسے کوئی انسان اکیلا انجام نہیں دے سکتا وہ چند یا بہت سے لوگوں کی مشترک توانائیاں ایک جگہ لگا دینا چاہتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص اکیلا ہی معمار، کسان، پارچہ باف، موچی، اور ندّاف وغیرہ سب کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ایک شخص اپنی انفرادی قوت سے، سڑک، دواخانے، تعلیم گاہیں۔ سب کچھ بنا کر تیار کر سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ باہمی تعاون سے اجتماعی قوت پیدا کی جائے، اور انسان یہ سب کچھ اپنے لئے مہیا کرے یا اس میں للّٰہیت و بے غرضی بھی موجود ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی محبت اور

خدا کی رضا کا تصور بھی کہیں کام کرتا ہے؟۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اجتماع کی بنیاد کیا ہو، صرف "منافع کا اتحاد" اور کیا اس تصور میں اتنی قوت پیدا ہو جائے گی کہ انفرادی جذبات و عواطف کو ایک واحد کل میں منضم کر دے کیا یہی منافع کا تصور رقابت اور بالآخر ظلم و تعدی نہیں پیدا کر دے گا۔ ایک سپاہی کیوں نہ اپنی قوت سے باقی سارے اہل حرفہ کو اپنا غلام بنا ڈالے۔ اور کیوں نہ کسان لوگوں کو غذا کے لئے تڑپا تڑپا کر اپنی حکومت و آقائی منوا لے اور اس کے بعد دوسروں کی توانائی سے فائدہ اٹھائے کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ یہی منافع کا خیال افراد تو افراد جماعتوں اور اقوام کو خود غرض بنائے ہوئے ہے، اور پوری انسانی آبادی انفرادی و جماعتی خود غرضی میں مبتلا ہو کر گمراہ رہی ہے۔

متضاد عناصر کا اجتماع

اس طرح یہ بھی سوچئے کہ دو آدمی جب تک مقصد زندگی میں متفق نہ ہوں، صالح اجتماع کس طرح پیدا ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک ملک میں کچھ لوگ تو رضاء خداوندی کے لئے عمل کرتے ہیں، اور کچھ محض نفس پرستی اور ذاتی التذاذ و مسرت کے لئے، کچھ خدائی قواعد کے پابند ہیں اور کچھ نفسانی اہواء و عواطف کے بہت سے ایسے ہیں جن کے نزدیک انسان ساری مخلوقات سے زیادہ قابل احترام ہے، اور بہت سے ایسے ہیں جن کے نزدیک گائے ساری مخلوقات سے زیادہ محترم ہے بلکہ مخلوقات سے برتر اسے پروردگار کا مقام حاصل ہے بعض وہ ہیں جن کے نزدیک ساری کائنات انسان کے لئے ہے اور خود انسان

حصول رضار خداوندی کے لئے بعض وہ ہیں جن کے نزدیک انسان پیپل کے درختوں کی حفاظت کے لئے معرض وجود میں آیا ہے اور سانپوں کو دودھ پلانا اس کا بہترین عمل ہے۔

ایسے متضاد عناصر سے جو اجتماع بنایا جائے گا۔ فی الحقیقۃ وہ کوئی پائیدار اجتماع نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے متضاد و متباین عقائد رکھنے والے اشخاص ایک ہی نسل کے ہوں۔ ایک ہی وطن میں زندگی بسر کرتے ہوں، ایک ہی زبان بولتے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دنیاوی نفع اور استفادہ میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کریں لیکن مقصدِ زندگی کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ تعاون نہ تو پائیدار تعاون ہوگا اور نہ اس سے وہ عظیم الشان نتائج مرتب ہوسکیں گے جو اجتماع افراد انسانی سے مقصود ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسانی آبادی کے لئے بنیاد اجتماع افکار و عقائد کے اتحاد کو قرار دیا، تاکہ وہ اعمال جو کوئی فرد انفرادی طور پر انجام نہیں دے سکتا اجتماعی طور پر انجام دیئے جائیں، اور ان کے انجام دینے میں ہر فرد کا مقصد انفرادی ایک دوسرے کے متخالف نہ ہو۔

مثال کے طور پر جنگ کو لیجئے۔ جنگ زمین گیری کے لئے بھی ہوتی ہے معاشی دستبرد کے لئے بھی، امن یعنی خدا کی برتری قائم کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے اور اپنی بڑائی و برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے بھی۔ اسلام نے بھی جنگ کی اجازت دی ہے، اور اجازت کیا دی ہے، جہاد فی سبیل اللہ

کو تو فرض قرار دیا ہے اور صرف اللہ اعلیٰ واجل کی رضا جوئی کے لئے فرض قرار دیا ہے ۔ لیکن مقاصد کے اختلاف سے اعمال اور نتائج کس قدر مختلف ہو جاتے ہیں ۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایئے ۔

پہلی صورت ایک ملک کی فوج دوسرے ملک پر چڑھائی کے لئے روانہ ہوتی ہے ۔ دشمن کے ملک کا تو ذکر ہی کیا، خود اپنے ملک کے جن علاقوں سے یہ فوج گزرتی ہے وہاں کی کھیتیاں ویران، باغ تاراج، لوگ دہشت زدہ، اور سہمگیں اور فوج کے گزر جانے کے بعد اس حصۂ زمین پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قیامت گزر گئی ۔ سپاہی انسانی حقوق کا مطلق خیال نہیں کرتے ۔ باغوں کی ویرانی کا انھیں ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا ۔

ایسا کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ انھیں معلوم ہے کہ ان کے مقصد جنگ کہ ان تباہ کاریوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور نہ ان کی تنخواہوں میں اس سے کوئی کمی پڑتی ہے ۔ ان کی بہادری و شجاعت کے تمغے اس سے کم نہیں ہو جاتے ۔ اس لئے انھیں اس قسم کے اعمال سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ۔

دوسری صورت مجاہدین کا ایک لشکر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے روانہ ہوتا ہے ۔ دشمن کے ملک میں داخل ہوتا ہے ہری بھری کھیتوں سے بچ کر نکلتا ہے کہ مبادا یہ پیروں سے کچل کر خراب نہ ہو جائیں، پھل دار درختوں کے باغ سامنے ہوتے ہیں، لیکن کسی مجاہد کا

ہاتھ ان کی طرف نہیں اٹھتا۔ محاربین سے جنگ ہوتی ہے اور پوری شدت کے ساتھ ہوتی ہے لیکن غیر متحارب آبادی اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ مجاہد اپنا گھر بار، اپنی بیوی بچوں اور اپنی کھیتی باڑی کو چھوڑ کر اس لئے جہاد میں آتا ہے کہ اس عمل سے خداوند تعالیٰ کی رضا اور اپنی حیات بعد الممات کے لئے سرمایہ جمع کرے وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے کھیتیاں ویران کیں، اگر اس نے باغ تاراج کئے اور اگر اس نے بے گناہوں پہ ہاتھ اٹھایا تو خداوند تعالیٰ کی ناخوشی اور عتاب کا مستحق ہوگا۔ اور اُسے ان اعمال کی سزا بعد الممات زندگی میں بھگتنی پڑے گی وہ دیکھتا ہے کہ جس مقصد کے لئے اس نے جہاد کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اُن اعمال سے وہ مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے اور نہ صرف فوت ہوا جاتا ہے بلکہ الٹی وہ ابدی مصیبتوں میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اس لئے لازماً وہ ایسے اعمال سے احتراز کرے گا۔

بالکل اسی طرح دوسرے تمام اجتماعی اعمال ہوتے ہیں، چاہے وہ رفاہی ہوں یا غیر رفاہی مسلمان چندے کر کے بھی شفاخانے بنواتے ہیں، اور کافر بھی۔ لیکن دونوں کے مقاصد میں بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ اور اس کے نتائج ان شفاخانوں میں قدم قدم پہ دکھائی دیتے ہیں کافروں کے اجتماعی کام شاندار، باقاعدہ، اور باضابطہ تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہر جگہ دکھاوا، ہر جگہ ستائش کی تمنا، ایک کتاب الرائے،

ایک چندے کا صندوق، عہدہ دارانہ شان، للہیت کا تصوّر مفقود، کسی برتر ہستی کی رضا کا خیال معدوم، اس کے برخلاف مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں بدنظمی و بے قاعدگی سہی مگر اللہ کی رضا کے خیال کا اثر نمایاں ہوتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اس کام سے نہ قومی برتری ثابت کرنا مقصود ہے اور نہ لوگوں کو فریب نظر میں مبتلا کر کے خاص قسم کے عقائد پھیلانا مدنظر ہے۔

کافر کا نظریۂ اجتماع

غرض یہ کہ انسان فطرۃً اجتماع پسند ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی فطری خواہش کو ایسے انداز میں پورا ہونے کا موقع دیا جائے جو اس کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ تلاش کیجئے تو اجتماع کی بنیادیں دو قسم کی ملتی ہیں، صرف دنیاوی منافع مشترک کا تصوّر اور خداوند تعالیٰ کی رضاجوئی جس میں منافع دنیاوی کو ایک ضمنی حیثیت حاصل ہو۔

کافرانہ تصوّر اجتماع میں صرف دنیاوی نفع مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے انھوں نے وطن، نسل، زبان، پیشہ، رنگ اور مشترک روایات قومی کو بنیاد اجتماع قرار دے رکھا ہے۔ اس طرح افراد انسانی ایک دوسرے سے مربوط ہو کر مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئے اور الگ الگ جتھ بندی وجود میں آتی ہے، پھر ان جتھوں میں اسی نفع کے تصوّر سے ٹکراؤ ہوتا ہے، ایک دوسرے کو غلام بنانے کی سعی ہوتی ہے۔ مختلف دفاعی و ہجومی قومیتیں وجود میں آتی ہیں۔ تجارت کی منڈیوں اور کچے مال کی بہم آوری کے

مواقع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی پولینڈ کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے، اور برطانیہ جرمنی کے خلاف دنیا آگ کے شعلوں میں جھلسنے لگتی ہے اور جوہری توانائی سے ملیا میٹ کی جاتی ہے۔ جرمنی تباہ ہو جاتا ہے، امریکہ اور روس میں رسہ کشی شروع ہوتی ہے ایک اپنی معاشی دستبرد اور تجارتی گیرائی میں ساری دنیا کو پکڑ کر زیادہ سے زیادہ منافع اپنی قوم اور اپنے جتھ کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا اپنا نظریہ لوگوں سے منوا کر اپنی سرداری کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ منافع دنیاوی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان نتائج کے سوا اور کوئی دوسرا نتیجہ اس اجتماع سے برآمد ہو سکتا ہے۔ جس کی بنیاد محض دنیاوی منافع کے اشتراک پر رکھی گئی ہو۔ یہ تو لازمی نتائج ہیں اس گمراہ یقین کے جس سے صرف حقوق کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور "فرائض" کا تصور دور جا پڑتا ہے۔ للٰہیت کے بغیر فرائض کا تصور کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ اور فرائض سے ذہن انسانی کو غافل کر کے محض حقوق کی طرف لگا دینے کا نتیجہ انفرادی و جماعتی خود غرضی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ خود غرضی سے آپ فساد فی الارض کے سوا کس چیز کی امید کر سکتے ہیں؟

اسلام کا نظریہ اجتماع

اسی لئے اسلام نے اجتماع نوع انسانی کی بنیاد صرف دنیاوی منافع مشترک کے تصور پر نہیں رکھی، تاکہ ذہن انسانی خود غرضیوں کے ناسور کا مقام

نہ رہ جائے۔ اور حکم دیا کہ تعاونوا علی البر و التقوی و لا تعاونوا

علی الاثم والعدوان۔ تعاون یقیناً ضروری ہے، انسان فطرۃً ایک

دوسرے کا تعاون چاہتا ہے، لیکن اس تعاون کی بنیاد بھی بر و تقوی

خدا پرستی اور پرہیزگاری پر ہونی چاہیئے۔ اثم (گناہ) اور بے اعتدالی

و بے راہ روی میں ہم وطن و ہم قوم تو کجا اپنے باپ اور اپنے بیٹے

کے ساتھ بھی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ افراد انسانی میں اجتماع کی بنیاد

نہ نسل ہو سکتی ہے اور نہ وطن، نہ رنگ ہو سکتا ہے اور نہ زبان، نیکوکار

اور بدکار کی دوستی نہیں، ظالم و عادل کا باہم جوڑ نہیں اور اچھے برے

کا باہمی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔

اس طرح اسلام نے یقین و عقائد اور ذہن و دماغ کی یکسانگی

کو اجتماع انسانی کی بنیاد قرار دیا اور بتا دیا کہ انسانوں کی صرف دو ہی

قسمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جس کے عقائد و اعمال کی بنیاد بر و

تقویٰ پر ہو ایسے انسانوں سے تعاون بھی کرنا چاہیئے، اور ان کے ساتھ مل کر

اجتماع کی تعمیر بھی ممکن ہے، اور دوسری وہ قسم جس کے اعمال و عقائد کی بنیاد

اثم و عدوان پر قائم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قسموں کے دو انسان ایک

ہی وطن میں رہتے بستے ہوں، ایک ہی زبان بولتے ہوں، ایک ہی رنگ و

نسل کے ہوں، لیکن ان کے درمیان تعاون عمل کو خدا نے جائز نہیں رکھا

کیونکہ مقصد عمل میں شدید اختلاف کے بعد عمل میں تعاون بے نتیجہ اور مضرت

رساں ہو جاتا ہے

فساد کا اصلی سبب

موجودہ بے چینیوں اور ساری دنیا پر حاوی فسادوں کا اصلی سبب یہی ہے کہ خدا کی بجائے وطن کو معبود بنانے پر بدقسمت انسانوں نے بنیاد اجتماع ہی بدل دی ہے۔ باہمی تعاون کی بنیاد بر و تقویٰ اور اس طرح رضائے خالق کی بجائے، ایک بے جان بت یعنی وطن کی سربلندی و بہبودی کے تصور پر قائم کردی گئی ہے۔ اس لئے انفرادی خودغرضی کے تمام ناپاک و سفلی جذبات نے خوفناک وسعت پاکر قومی خود غرضی اور وطن پرستی کی شکل اختیار کرلی اتنی خوفناک شکل کہ اس کے مقابلہ میں بر و تقویٰ اور نیکی و نیکوکاری کا انفرادی و اجتماعی تصور مردہ ہوگیا ہے۔ آج اگر کوئی متقی اور نیکوکار شخص سچی بات کہہ دیتا ہے یا انسانیت سے محبت کی تلقین کرتا ہے تو وطن پرستوں کی بارگاہ سے اُسے "غدار وطن" کا لقب دیا جاتا ہے، اور وطنی حکومت اُسے سزائے موت دیئے بغیر نہیں مانتی۔

ایمان سے سوچئے، آج انسان کی اجتماعی زندگی میں برتر مقام کسے حاصل ہے، اسی کمینے اور دون فطرت انسان کو جو وطن کے لئے ہر طرح کی قربانی و ایثار کے لئے بار بار اپنے آپ کو پیش کرتا رہا ہو ایسے کمینہ اور ذلیل انسان سے بھلائی کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے جو وطن کی سربلندی کے لئے بر و تقوی کے حدود کو توڑ سکتا ہے اور دوسرے انسانوں کو ذلیل کرسکتا ہے، اس سے کس مرحلہ میں آپ نیکی و نیکوکاری کی اُمید کرسکتے ہیں؟

تم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہ ایک بنیادی مسئلہ اور وقت کا سب سے اہم سوال ہے، یاد رکھیے کہ وطن کی سربلندی کا تصوّر اور نیکوکاری کا خیال دونوں ایک ہی سر اور ایک ہی دماغ میں قائم نہیں رہ سکتے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر شخص اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھے، اللہ کی رضا کا یقین رکھکر اس کے لئے جدوجہد کرے اور ایسے تمام انسانی دماغوں کا اپریشن کرے جن میں وطن پرستی، نسل پرستی، رنگ پرستی۔ غرض خدا پرستی کے سوا سب کچھ بھرا ہوا ہے، جب تک یہ سڑا ہوا اور متعفن مادّہ خارج نہیں کیا جائے گا۔ اور موجودہ کافرانہ اصطلاحات میں "غداران وطن" کی ایک خداپرست اور صالح جماعت پیدا نہ ہو گی، انسانیت کی موجودہ تکالیف کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

مولانا حیدر زماں صاحب صدیقی کی یہ مختصر سی کتاب اس مقصد کے لئے ایک نہایت مفید کتاب ہے، طرز بیان شگفتہ اور مدلّل ہے، عبارت بھی کچھ مشکل نہیں، اور باوجود اختصار کے مولانا نے دلنشیں انداز میں مسئلہ زیر بحث سے متعلق تقریباً وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کے کہنے کی ضرورت ہے۔ فجزاھم اللہ خیرا۔

عبدالقدوس ہاشمی

پیش لفظ

دنیا کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اقوام عالم کی وطنی، اور نسلی رقابتوں نے پوری دنیا کو اضطراب و بدامنی کے شعلوں کی لپیٹ میں لاکھڑا کیا ہے اور اب امن و خوشحالی کی اُمید، اُمیدِ موہوم ہوکر رہ گئی ہے۔ ان حالات میں مسلمان اور صرف مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُٹھے اور مظلوم انسانیت کو اقوام غالبہ کے جبر و تشدّد سے نجات دلائے کیونکہ پوری کائنات میں صرف مسلمان ہی ایک ایسے نظریۂ اجتماع کا علمبردار ہے جو قبیلوی، نسلی اور وطنی قیود سے بالاتر اور انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات کا ضامن ہے۔

گذشتہ دو صدی سے اسلامی دنیا نے اقوام مغرب کے نظریۂ ہائے قومیت و وطنیت کا شکار ہو کر ہمہ گیر اخوت اسلامی کو اپنے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بین الاسلامی اتحاد (پان اسلامزم) کو ایسا دھکا لگا کہ آج تک ممالک اسلامی اغیار کے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے ہیں مگر اب جب کہ اقوام یورپ کی روح اخلاقی قیود و اقدار سے بے نیازی مادہ پرستی کے انہماک اور حرص زر و سیم کی وجہ سے بیکار ہو چکی ہے اور عالم انسانی ایک بہت بڑے انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے اصلی مقام و موقف کی جانب بیتابانہ حرکت شروع کر دے۔

اگر او را مقامش باز بخشند
جمال او جلال بے پناہیست

اور اس ظالمانہ طبقاتی نظام اجتماع کو ختم کر کے قرآنی نظریۂ اجتماع و سیاست کے ذریعہ دنیا کو حریت و

مساوات اور امن و فراغ کی برکات سے مالا مال کردے

اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ اسلام کے فلسفۂ اجتماع کے تمام اجزاء کو اصلی رنگ میں پیش کیا جائے تاکہ جو مسلمان فکرِ اسلامی کو چھوڑ کر فکرِ فرنگی اور فکر ہنود کی لعنت میں گرفتار ہو چکے ہیں وہ اپنے اصلی مقام کی طرف واپس آجائیں اور غیر مسلموں کو اسلامی نظریۂ حیات کی عالمگیر افادیت کا یقین ہو جائے

یہ کتاب اسی کوشش کی دوسری کڑی ہے۔ یعنی "اسلامی نظریۂ سیاست" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس کے کچھ حصّے مجلۂ معارف میں شائع ہو چکے ہیں اور "اسلامی نظریۂ معیشت" تاحال زیر تصنیف ہے اُمید ہے کہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

صدیقی (پٹھانکوٹ)

اِسلامی نظریۂ اجتماع

تصوّرِ اجتماع اور حیاتِ ملّی

حیات انسانی کے شعبۂ عمل کا ہر زاویہ انسان کی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ بلکہ جولانِ طبع اور رفتارِ فکر کے ساتھ ساتھ زندگی کے عملی زاویئے بھی متغیر ہوتے چلے جارہے ہیں اور نقشۂ حیات کے خالی اور بے رنگ خانے بھی وارداتِ قلب کی رنگینیوں سے چمک اٹھتے ہیں اور اس طرح فرد اور جماعت کے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ علم النفس (سائکالوجی) کے مسلمات سے ہے کہ انسان کے قلب وجسم میں ایک نہایت گہرا اور پائدار تعلق ہے اور بیشتر جسمانی اعمال و وظائف نفسیاتِ ذہنی کے مظاہر ہیں اور انسان کا ہر شعوری اور ارادی فعل اس کے نقوشِ قلب کے اجمال کا شارح ہے بلکہ

حرکات جسم کا نقطۂ مرکز یہی چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس سے پورے جسم کا صلاح و فساد وابستہ ہے۔

الا اِنَّ فی الجسد مضغةً اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب۔ (اخرجہ البخاری)	ہاں! جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے کہ اس کے صلاح سے سارا جسم صالح اور اس کے فساد سے سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے وہ کیا ہے؟ دل!

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

وہ چاہت اور محبت جس سے کون و مکاں کی ہر چیز زندگی کی پرکیف مسرتوں سے سرشار نظر آتی ہے اسی نہاںخانۂ دل میں قرار پکڑتی ہے۔ اور یہی وہ مرکزِ انوار ہے جس کی ضیاء ریزیوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ تابانی حاصل کر رہا ہے اور حیاتِ انسانی کی بلند پروازیاں اسی

طائرِ لاہوتی کے بال و پر کی رہینِ منت ہیں۔

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را (اقبالؒ)

یہ کون نہیں جانتا ؟ کہ انسان کے ظاہر و باطن میں ایک قسم کا برقی تعلق ہے اور قلب کی برقی رَو جسم کے ہر حصہ پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشی کے وقت انسان کا چہرہ بشاشت و مسرت سے چمک اٹھتا ہے اور اندوہ و غم سے ظاہرِ جسم پر غیر معمولی تکان اور بے چینی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں، حالانکہ خوشی اور غم قلبی کیفیات ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ بھوک کا علاج غذا سے اور پیاس کا پانی سے ہوتا ہے۔ یہاں تک تو علم و یقین کا درجہ ہے اب بھوک لگنے پر غذا اور پیاس کے وقت پانی کا استعمال فعلیت کا درجہ ہے۔ گویا مرتبۂ فعلیت علم و یقین کی شعاعوں کا عکسِ اولین ہے

علم ویقین اور عمل میں بالکل وہی تعلق ہے جو نور وضیاء اور اشعۂ شمس میں ہے جہاں سورج کی شعاعوں کی رسائی ممکن ہے وہاں حسب استعداد وصلاحیت روشنی کا پایا جانا لازمی ہے اشعۂ منعکسہ کی قوت اور عکس پذیر اشیاء کی استعداد کے تناسب پر روشنی کی قوت و ضعف کا انحصار ہے۔ جب یہ شعاعیں کسی لطیف، شفاف اور چمکدار چیز پر پڑتی ہیں تو وہاں حیرت انگیز چمک اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی روشنی نمودار ہوتی ہے اور اگر عکس پذیر چیز کے آگے غلیظ پردہ حائل ہو یا وہ خود کثیف اور سیاہ رنگ ہو تو وہاں بھی یہ شعاعیں اپنا اثر دکھاتی ہیں مگر وہ روشنی (لائٹ) پیدا نہیں ہوتی۔

بالکل اسی طرح قلب کی برقی لہر کی قوت اور جسم کی صلاحیت و استعداد کے توافق اور توازن سے ہی حیاتِ شخصی اور حیات اجتماعی کے نتائج وابستہ ہیں۔

کذالک تنشأ لینۃ ہو عمر قہا
وحسن نبات الارض من کرم البذر

اس فعل و انفعال کا محل اول اگرچہ فرد ہے
حیاتِ ملّی، فرد کی حیات مشخصہ سے الگ نہیں بلکہ قوم اور جماعت کی اجتماعی زندگی کا اصل ماخذ حیاتِ فرد ہی ہے اس لیے جماعت کا وجود شخص کے وجود کی ہی ایک دوسری شکل ہے اور جماعت کی ذہنی اور عملی استعداد درحقیقت افراد کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔

یا یوں کہنا چاہیئے کہ شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اگرچہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے مگر جب تک اس کے کمالاتِ شخصی جماعت سے انضمام پذیر نہ ہوں وہ خود بھی اپنے کمالات سے متمتع نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کے ذاتی جوہر کی کوئی قدر و قیمت ہوسکتی ہے اس لئے فرد بہ ہر حال اپنے کمال شخصی کی افادیت و اظہار میں جماعت کا محتاج ہے اور جماعت جس طرح اپنے وجود میں وجودِ فرد

کی محتاج ہے اسی طرح اس کے مقدر کی تابانی فرد کی شعاع ریزیوں کی رہینِ منت ہے ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

مگر دیکھنا یہ ہے کہ قلب کی یہ پُراسرار قوت کس طرح درجۂ کمال کو پہنچتی ہے؟ اور کس طرح فرد کی تکمیل ذات کا ذریعہ بنتی ہے؟ درحقیقت اس روحانی قوت کی اصلاح و تربیت صرف ایک چیز سے ہوتی ہے جسے۔قرآنِ حکیم اپنے حکیمانہ انداز میں "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی تقویٰ کو سعادتِ انسانی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے اور یہی حیات ملی کی واحد اساس ہے۔

وَ مَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (الآیہ)	جو شخص تقویٰ سے متصف ہوگا خداوندتعالیٰ اس کیلئے زندگی کی تمام شاہراہیں کھول دیگا اور

نامعلوم ذرائع سے اس کی ضرورتوں
کی تکفیل کرے گا۔

"تقویٰ" دراصل ایک قرآنی اصطلاح ہے اور اس کا اطلاق قلب کی اس کیفیت پر ہوتا ہے جو انسان کو نوامیس فطرت کے احترام، اقدار شریعت کے اتباع اور حدود و احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کی موجودگی میں انسان کا کوئی قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھ سکتا بلکہ قدم اٹھانے سے پہلے اُسے اپنے ضمیر الٰہی دستورِ اخلاق، اور نوامیس شریعت سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن پر تقویٰ کا رنگ نمایاں ہونا چاہیئے۔ یہاں تک کہ انسان کے لئے حقیقی لباس اسی تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِي	اے آدم کے بیٹو! ہمنے تمھارے لئے لباس اتارا جو تمھاری شرمگاہوں

سَوْآتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ.

(انعام)

کو چھپاتا ہے اور تمھارے لئے زینت بھی ہے لیکن یاد رکھو تقویٰ کا لباس ہی بہترین لباس ہے۔

اور عشق و محبت کی دور دراز منزلوں کو طے کرنے کے لئے زادِ سفر بھی یہی تقویٰ ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى.

زادِ راہ تیار کرو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

نیز مقام رفعت تک اگر انسان کی رسائی ہوسکتی ہے تو صرف اس تقویٰ کے توسط سے۔ اور کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ.

(سورۂ حج)

قربانی کے گوشت اور خون کو بارگاہ رب العزت تک رسائی نہیں ہوسکتی وہاں تک جو چیز پہنچ سکتی ہے۔ وہ تقویٰ ہے۔

وادیٔ عشق اگر دور و دراز است و لے

طے شود جادہ صد سالہ بآہے گاہے (اقبال)

اور یہی وہ قوت قاہرہ ہے جو فولادی قلعوں کو پاش پاش کردیتی ہے۔ اور تنہا غلبہ و تسلط کی ضامن ہے۔ مراحل عشق کو طے کرنے اور زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھا جانے کے لئے یہی پُراسرار طاقت کام آتی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ۔ (الانفال)	اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو خدائے ذوالجلال تمھارے اندر بے پناہ معجزانہ قوت (قوت فارقہ بین الحق والباطل) پیدا کرے گا۔ اور (تمھاری لغزشوں کو معاف کردے گا۔

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب

تنہا جہاں بگیرد بے منت سپاہی

اسی سے سیرت و کردار میں پختگی اور اعمال میں نظم و انضباط پیدا ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (سورۂ احزاب)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو۔ خدا تمھارے اعمال میں درستی پیدا کر دے گا۔

غرض تقویٰ اپنے مفہوم کے اعتبار سے تمام انسانی افکار و اعمال پر حاوی ہے۔ اور زندگی کا کوئی زاویہ اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہیں یہاں تک کہ اطاعت و ایثار جو حیاتِ اجتماعی کے لوازم ہیں اسی تقویٰ سے حاصل ہوتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (انفال)

اللہ سے ڈرو۔ اپنے معاملات کی اصلاح کرو۔ اور خدا و رسولؐ کی اطاعت کرو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ظاہر و باطن کی اصلاح نہ ہو جائے جو تقویٰ کا منشار ہے حقیقی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ آیت میں تقویٰ کے بعد اصلاح اور اصلاح کے بعد اطاعت کا ذکر ہوا ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا۔ کہ

انسانی تصوّرات قوم و ملّت کے تعمیری ارکان میں "خشت
اوّل" کی حیثیت رکھتے ہیں بالخصوص وہ اجتماعی نظریے جو
فرد کے دائرۂ وجود سے آگے نکل کر جماعت پر اثر انداز
ہوتے ہیں اپنی عمومی نوعیت کے اعتبار سے صرف جماعتی فکر
اور جماعتی کردار میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں اور تصوّر اجتماع
بھی ان ہی عمومی تصورات سے ہے جو جماعتی سیرت اور جماعتی
نظم کی تخلیق میں سب سے زیادہ موثر ہیں یعنی قوم و ملت
کے صلاح و فساد میں سب سے زیادہ اسی کو دخل ہے
اور اسی سے مدنیت صالحہ یا مدنیت فاسدہ کا ظہور
ہوتا ہے۔ اگر داعیہ اجتماع کو داعیہ فطرت سے کامل
مناسبت ہوگی تو اس سے ایک صالح مدنیت اور صالح طرز
اجتماع عالم وجود میں آئے گا اور پھر اس حضارت و
مدنیت سے ایک صالح اور مہذب سوسائٹی کی تکوین
ہوگی۔ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مثالی
(آئیڈیل) حیثیت کی مالک ہوگی اور اس کا وجود ساری

دنیا کے نظم پر اثر انداز ہوگا بلکہ کائناتِ عالم کے حقیر سے حقیر ذرّے بھی اس کی ضیاء باریوں سے چمک اُٹھیں گے۔

اور مفاد فطرت داعیۂ اجتماع سے جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل ہوگی وہ نوع انسانی کو قعر مذلت کی طرف لے جائے گی یہاں تک کہ ساری دنیا اس کے ناپاک وجود سے ہلاکت و بربادی کے جہنّم میں جا پڑے گی کسی نظریۂ اجتماع کے صلاح و فساد کا یہی ایک معیار ہے جس سے اس کے حُسن و قبح کو معلوم کیا جاسکتا ہے مگر اقوام حاضرہ ان حقائق سے دانستہ یا نادانستہ بے اعتنائی کر رہی ہیں جس کے تلخ نتائج سے آج ان کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

انسان کو جس قدر اپنی عقل و دانش اور فہم و ادراک پر فخر ہے اس کے بجائے اگر اس کی نظر اپنی کم مائگی اور عجز و بے لبسی پر ہوتی تو عالم انسانی اس عالم گیر

اضطراب اور جبر و تشدد کی دست برد سے محفوظ ہوتا۔ عدل و انصاف اور امن و مساوات کی اس طرح ہرگز رسوائی نہ ہوتی جس طرح کے آج ہو رہی ہے۔ مگر خود فریبی و خود بینی، نوامیس فطرت سے بے اعتنائی اور ظالمانہ طرز اجتماع نے آج اسے یاس و حرماں اور حسرت و ناکامی کے ایسے بحر ناپید کنار میں دھکیل دیا ہے جہاں سے اس کی نجات امر موہوم ہو کر رہ گئی ہے

مگر تعجب ہے کہ حضرت انسان کچھ اسس طرح زمان و مکان کے طلسم میں کھو گیا ہے کہ ان دہشت ناک خونین منظر کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے طرز عمل پر غور نہیں کرتا اور فضائے عالم میں پھیلی ہوئی تاریکیوں "ظلمت بعضہا فوق بعض" میں ہی حق و صداقت کی شعاع تاباں "نور مبین" کی طرف نہیں آنا چاہتا۔ کیا اس سے بڑھکر بھی انسان کی شومئ قسمت اور سیاہ بختی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کہ ہلاکت و بربادی کے تیرہ و تار بادل

سر پر منڈلا رہے ہیں مگر اس کی غلط روی میں سرِ مو فرق نہیں آتا عذابِ الٰہی کی بجلیاں لگاتار کوند رہی ہیں مگر یہ خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتا۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ آفاق عالم اور عالم النفس میں ہم ان منکرانِ حق کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کو کتاب اللہ کی صداقت تسلیم کرنی پڑے گی۔ (سورۂ حم سجدہ)

دوسری جنگ عظیم کے نتائج نے آج کائنات انسانی کو جن مصائب سے دوچار کر دیا ہے وہ کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور ابھی ایک تیسری جنگ کے لئے مادہ پک رہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ آئندہ جنگ کے نتائج کیا ہوں گے اور دنیا کی بڑی سلطنتوں (گریٹ امپائرز) کا آئندہ نقشہ کیا ہوگا؟

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم (اقبال)

کتاب و سنت کی روشنی میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ عالمگیر اضطراب و بے چینی، اسی مدنیت فاسدہ اور ظالمانہ طرز اجتماع کا قدرتی معاکسۂ عمل (ری ایکشن) ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ	بحر و بر کا یہ ہمہ گیر فساد انسانوں کی
الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي	لگاتار بداعمالیوں اور بدعنوانیوں
النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ	کا نتیجہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان
الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ	کے اعمال کا مزہ چکھائے کہ شاید وہ
يَرْجِعُونَ ۔ (توبہ)	حق کی طرف رجوع کریں۔

آج اس عذاب الٰہی کے مناظر ہمارے سامنے ہیں جس کے امثال و نظائر کتب سماویہ میں اقوام سابقہ کے تذکروں میں ملتے ہیں، آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے آپ کو اس حقیقت باہرہ کا یقین ہوسکتا ہے کہ خدائے قدوس کی مخفی اور پر اسرار طاقتیں ہر وقت اپنے کام میں مصروف اور مناسب

وقت کی منتظر رہتی ہیں۔

ولا تحسبن اللہ غافلاً عمّا یعمل الظالمون	تم اللہ کو ان ظالموں کی بداعمالیوں سے غافل تصور نہ کرو۔

قرآن کریم دنیا کے انسانوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ سنن الہٰیہ اور مکافاتِ عمل کے قدرتی نتائج پر غور کرو اقوام سابقہ کی تاریخ (ہسٹری آف نیشنز) کو امکان نظر سے دیکھو اور سوچو کہ ہم نے ان ظالم اقوام سے کیا سلوک کیا؟

وسکنتم فی مساکن الذین ظلموا انفسھم وتبین لکم کیف فعلنا بھم و ضربنا لکم الامثال۔ (ابراہیم ۱۳پ)	تم بھی ان ظالموں کی بستیوں میں رہ رہے ہو اور تمھیں معلوم ہوچکا کہ ان سے ہم نے کیا سلوک کیا عبرت و موعظت کی مثالیں تمھارے لئے بیان کردی ہیں۔

قدرت کا قانون کیا ہے؟ جب انسانی آبادی ظلم و عدوان، جبر و قہر، زر پرستی، خود غرضی اور غصب حقوق انسانی

سے مضطرب ہوجاتی ہے تو خدا کی انتقامی قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں، پھر کیا ہوتا ہے؟ آبادیوں پر قہر الٰہی نازل ہوتا ہے اور تمام بستیاں ویرانوں اور کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ یہ عذاب الٰہی کبھی آسمان کی بلندی سے اترتا ہے کبھی زمین کے نیچے سے اُبل پڑتا ہے اور کبھی اقوام عالم میں حسد و رقابت کی چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں اور ان کو خطرناک طبقاتی جنگ (سیکشنل وار) میں مبتلا کردیا جاتا ہے جس کی شعلہ باریوں سے انسانوں کے ردی اور فاسد عناصر کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور بقاء اصلح کے قدرتی تصور کے مطابق دنیا میں وہ صالح عناصر باقی رہ جاتے ہیں جو صحیح طور پر خدا کی زمین میں امن و مساوات اور عدل و انصاف کے ضائع شدہ متاع سے دنیا کو روشناس کراتے ہیں اور ان الارضِ للہ یرثہا عبادی الصالحون کا عام اعلان کرتے ہیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ	خدائے قدوس اس پر قادر ہے کہ
يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا	بلندی سے عذاب اتارے یا زمین
مِنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ	کے نیچے سے یا تم کو کئی طبقوں میں
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ	تقسیم کرکے ایک خطرناک طبقاتی
يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (توبہ)	جنگ میں ڈھکیل دے۔

اقوام سابقہ کی بہت سی مثالیں قرآنِ حکیم نے وضاحت سے بیان کردی ہیں جو ارتکاب، منکرات و منہیات اور فساد و عصیان کی وجہ سے قدرت کے "بطش شدید" میں آئیں، ان کے پُر رونق شہر، سربفلک عمارتیں اور اموال و املاک کو ایک ہی لمحہ میں پیوندِ خاک بنا دیا گیا۔ اور بستیاں اس طرح ویران ہوگئیں کہ اس کے بعد پھر کبھی آباد نہ ہوسکیں۔

وَلَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (آیہ)

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن قوموں کی تباہی کی وجہ نوامیسِ فطرت کی توہین اور

ان کے طرزِ اجتماع کا فساد و اختلال تھا ان کے فکر و عمل اور طریقِ تمدن و معیشت میں رخنہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ضابطۂ اخلاق کی کڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ (قصص)

بہت سی بستیاں جنھوں نے فطری طرزِ معیشت کی حدوں کو توڑ دیا۔ ان کو ہم نے ہلاک کیا اب یہ ان کے مکانات ہیں۔ جو غیر آباد اور سنسان پڑے ہیں اور ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے۔

اذا اردنا ان نهلك قرية آمرنا مترفيها ففسقوا فيها۔ (الآیہ)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو بہت سے امرا پیدا کر دیتے ہیں یا ان کی دولت بڑھا دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہاں "اَمَرْنَا" کے معنے "اکثرنا" کے لئے گئے ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کی جو تفسیر نقل کی گئی ہے اس میں انھوں نے امر کے معنے کثرت کے بیان فرماتے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں ۔

کُنَّا نَقُوْلُ لِلْحَيِّ اذا كثروا فى الجاهِلِيَّةِ اَمَرَ بَنُوْ فلان.	زمانۂ جاہلیت میں جب کسی قبیلہ کی تعداد بڑھ جاتی تو ہم کہتے تھے کہ فلاں قبیلہ کے لوگ بڑھ گئے ہیں۔
(البخاری کتاب التفسیر)	

قرآنِ حکیم میں غور کرنے سے یہ حقیقت ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ اقوام عالم کے عروج و زوال کا پس منظر ان کے طرزِ اجتماع اور طریقِ تمدن کے طبعی یا غیر طبعی رجحانات ہیں ۔ اس "کتابِ ہدایت" میں ہر قوم کی دو حالتیں دکھائی گئی ہیں ایک حالت یہ ہے کہ وہ قوانین طبعی (لاز آف نیچر) کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے ، اخلاق و سیرت

حضارت وتمدن اور معاشی اعتبار سے بہت اونچی سطح پر کھڑی ہے امن و خوش حالی اور یُسر و فراغ کے تمام وسائل اُسے میسر ہیں اور آزادی و حریت کی نعمت سے مالا مال ہے۔

اور دوسری حالت یہ ہے کہ دولت وثروت کی فراوانی اور سامانِ معیشت کی کثرت نے اُسے اندھا کردیا ہے اور اب وہ نشۂ دولت میں مخمور اور نوامیس فطرت سے بے نیاز ہوچکی ہے۔ اخلاقی قیود و اقدار اور طبعی قوانین سے آزاد اور خلاف فطرت خواہشات کی غلام بن چکی ہے۔ بس اجتماع و سوسائٹی کی یہی وہ ناقابلِ اصلاح حالت ہے جس سے قدرت کا ضابطۂ انتقام حرکت میں آجاتا ہے۔

وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ ان اخذہٗ الیم شدید۔ خدائے تعالیٰ کی پکڑ ایسی ہی ہے۔ جب کہ وہ ظالم اقوام کو پکڑتا ہے بیشک اسکی پکڑ بہت سخت اور دردناک ہے

مثال کے طور پر قوم "سباء" کا جہاں ذکر آتا ہے تو پہلے اس کی حالت فراغ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لِسَبَأٍ فِیْ مَسْکَنِہِمْ آیَۃٌ جَنَّتَانِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَہٗ۔ بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ۔ (سبأ)	قوم سبار کے لئے ان کے اپنے وطن میں قدرت کی نشانی موجود تھی۔ یعنی (تین سو مربع میل تک) باغ ہی باغ تھے۔ اور ان سے کہدیا گیا تھا کہ خوب کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔ رہنے کو پاکیزہ شہر ہے۔ اور رب معاف کرنے والا ہے

مگر اس کے بعد ان کی دوسری حالت کا جس رنگ میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ کریں

وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَہُمْ فَجَعَلْنٰہُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰہُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (سبأ)	انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور ہم نے ان کو حقیقت سے افسانہ بنا کر رکھدیا اور ان کے ٹکڑے اڑا دیئے

وَمَزَّقت سَبَاٍنی کل نامیۃ ملک کے ہر حصے میں سبأ کے
فَمَا التَّقی انج بھم پُرزے اڑا دیئے گئے اور کسی
لبستکو۔ صبح کرنے والے کو ان کی
ہوا بھی نہ لگ سکی۔ (ابن عبدون)

اقوام حاضرہ کا طریق سیاست اور طرزِ اجتماع بھی اسی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے اور یہ صرف میں ہی نہیں کہتا بلکہ خود اہل مغرب کا اہل دماغ اور سنجیدہ طبقے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ آج یورپ کی سیاست و مدنیت ایک خطرناک حالت تک پہنچ چکی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ اقوام مغرب کی مادہ پرستی، جذبۂ زرپرستی اور مذہب و روحانیت سے قطع تعلق ہے جس نے ان اقوام کو اخلاقی قیود و اقدار اور نوامیس

فطرت کی پابندی سے بے نیاز کردیا ہے اور عالمگیر اخوتِ انسانی کئی متخالف گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے اور اسی چیز نے ان کو دائمی اضطراب و بیچینی اور شورش و بدامنی کے بے کنار سمندر میں ڈھکیل دیا ہے یہاں تک کہ آج وہ خود بھی اس جدید مہلک تمدن کے ہاتھوں سخت مصائب کا شکار بن چکے ہیں اور آنے والے خطرات ان کی آنکھوں کے سامنے منڈلا رہے ہیں۔ اس ہلاکت خیز تمدن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ہرچند ان کے اہل فکر حضرات کوشش کر رہے ہیں مگر اب جب کہ اس مدنیت فاسدہ کی لہروں نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مشہور فرانسیسی مصنف فیرلنس جیافرت

اپنی کتاب "الغمۃ الحاضرہ"

میں رقمطراز ہے

"جو لوگ فقر و فاقہ اور رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں ان کے دلوں میں بغض و عناد اور عداوت و دشمنی کی چنگاریاں پہلے سے زیادہ مشتعل ہو رہی ہیں اور اسی اندازہ کے ساتھ سرمایہ پرست طبقوں میں کبر و نخوت کا جنون بھی بڑھتا جا رہا ہے اور یہ ترقی پذیر الحاد ہماری جماعات کے جذبات حریت و مساوات کو ایک دائمی اور شدید انتقامی جذبہ میں تبدیل کر دے گا ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ نوع انسانی کے مصائب کا ان مادی خزائن سے مداوا کر سکیں گے جو ایک زمانہ سے ہمارے آگے پڑے ہیں جیسے علماء ہندسین صناع، میکانکیین (میکینکس) حیات دینوی کے عروج و ترقی کے لئے جان توڑ کوشش میں مصروف ہیں مگر اکتشافات سے صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ عوامی

طبقوں میں بھی سرمایہ پرستی کا مرض پہلے سے
زیادہ پھیلتا جارہا ہے۔

مجلۃ الازہر، ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

غرض اس طرح کے سینکڑوں فضلاء مغرب کے
اقوال پیش کئے جاسکتے ہیں مگر ہم نہیں چاہتے کہ اصل
مقصد سے ہٹ کر دور از کار باتوں میں الجھ جائیں۔

یہاں تک تو صرف کتاب اللہ سے استشہاد
کیا گیا ہے کہ مضادِ فطرت تصوّر اجتماع سے جو مدنیت
فاسدہ اور ظالمانہ طرز اجتماع عالم وجود میں آتا ہے وہ
کائناتِ انسانی کو سخت خطرات و مہالک میں مبتلا کردیتا
ہے اب ذیل میں ہم احادیث و آثار سے بھی اس
سلسلہ میں شہادتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

عن عبادۃ ابن الصامت رض	آنحضرت صلعم فرماتے تھے کہ
قال کان رسول اللہ	اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کا بقاء
یقول ان اللہ اذا اراد بقوم	یا اس کی نشوونما مطلوب ہوتی

بقاءً او نماءً رزقهم السماحة والعفاف واذا اراد بقومٍ اقتفاعًا فَتَحَ عَلَيْهِمْ باب خيانةٍ ثم قرءَ حتى اذا فرحوا بما اُوتُوا اخذناهم بغتةً فاذا هم مبلسون (اخرجه ابن عساکر)	ہے تو اس میں فیاضی اور عفت و پاکدامنی کی طرح کی پاکیزہ صفات پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی قوم کو ختم کرنا چاہتا ہے تو اس پر خیانت بددیانتی اور اس قسم کی صفات ذمیمہ کے دروازے کھولدیتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔۔'

یہاں تک کہ وہ ہماری دی ہوئی دولت پر مغرور ہو گئے تو ہم نے ان کو ناگہانی طور پر پکڑ لیا۔ پس وہ یاس و ناامیدی کی حالت میں پڑے رہ گئے۔

عن علیؓ قال اِن الله فرض على الأغنياء فی اموالهم ما يكفی فقراءهم وان	اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار فرض کی ہے جو غربا کے لئے کافی

جاعوا وعروا وجهدوا فبمنع الأغنياء وحق على الله ان يحاسبهم يوم القيامة ويعذبهم	ہو سکے، اس کے باوجود اگر وہ بھوکے ننگے اور تنگدست ہوں تو یہ صرف دولتمندوں کے عدم توجہ اور بخل کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے اور اللہ نے اپنے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے
(اخرجہ البیہقی سعید ابن منصور فی سننہ)	کہ ان امراء سے قیامت کو محاسبہ لے اور ان کو عذاب دے۔

جس طرح قوموں کے طرز اجتماع کا فساد و اختلال ان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اسی طرح صالح طرزِ اجتماع نظامِ عالم کے بقاء اور قوم و ملت کی فلاح و نجات کو مستلزم ہے حضرت عبداللہ ابن رواحہ کے اس مشہور واقعہ سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے

یہود خیبر نے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو بیش بہا زیور اور کافی مال رشوت کے طور پر دینا چاہا اور آپ سے درخواست کی کہ مالیہ کی رقم میں کچھ تخفیف کردی جائے

اس موقعہ پر عبداللہ ابن رواحہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا اور پھر یہود کی زبان سے بے ساختہ جو الفاظ نکلے وہ بعینہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

فقال عَبْدُ اللہ ابن رواحہ	اے یہود کے گروہ تم خدا کی مخلوق
یا معشر الیہود انکم لمن	میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل
ابغض خلق اللہ الیَّ	نفرت ہو مگر اس کے باوجود میں تم
و ما ذالك يحا ملنی	پر ظلم کرنا روا نہیں سمجھتا۔ اور تم نے میرے
علی ان احیف علیکم	آگے جو رشوت پیش کی ہے وہ
فامّا ما عرضتم من	حرام قطعی ہے اور میں اس کو ہرگز
الرشوة فانما هی سحت	نہیں کھاؤں گا۔ یہ سنکر یہود پکار اُٹھے
وانالا آکلها فقالوا بهذا قامت	کہ ایسی عدل و انصاف اور دیانت سے
السمٰوات والارض (موطا امام مالک)	زمین و آسمان کا نظام قائم ہے

آنحضرت صلعم کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ اقوام عالم میں حسد و رقابت کی چنگاریاں پوری قوت سے مشتعل ہو رہی تھیں اور وہ ایک خطرناک طبقاتی جنگ (سیکشنل وار)

ہیں مبتلا تھیں طبقۂ امرا کا جذبۂ زرپرستی حد انتہا تک پہنچا ہوا تھا اور پس ماندہ طبقے ان ظالم اور سفاک انسانوں کے پنجہ ہائے استبداد میں جکڑے ہوئے تھے مگر سردار دوجہاں صلعم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس کوششوں نے اس جاہلی نظام اجتماع کے پرزے اڑا دیئے۔

آنحضرت صلعم نے امرا کے پندار و غرور کو مٹانے اور غریب طبقوں کو ابھارنے کے لئے جو کامیاب جدوجہد فرمائی اس کے نتائج روز روشن کی طرح واضح ہیں ایک موقعہ پر آپ نے غربا کی عظمت شان کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا۔

هل تنصرون و ترزقون الا بضعفاء کم (بخاری)

اے طبقۂ امرا، غریبوں کی بدولت ہی تمھیں ہر قسم کی مدد اور روزی ملتی ہے

مجھے آئندہ مباحث میں کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بتانا ہے کہ یہ تمام مفاسد و مصائب جو موجودہ اجتماع

انسانی میں پائے جاتے ہیں ان کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟
مگر اس سے پہلے یہ تبانا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی
روشِ فکر و عمل اور ان کے طرز اجتماع میں تبدیلی پیدا
کرنے والے کون سے اسباب ہیں اور کس طرح مسلمانانِ
عالم بالعموم اور مسلمانانِ ہند بالخصوص اسلامی طریقِ فکر و عمل
کو ترک کر کے غیر اسلامی سیاست و اجتماع کے دام ہمرنگ
زمین میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں؟ یا یہ کہ جاہل افکار و
نظریات کس کس راستہ سے اسلامی نظریۂ اجتماع
میں نفوذ کر کے اس کے فساد و اختلال کا موجب
بنے ہیں؟

اسلامی نظامِ اجتماع
کے
اِختلال کا تاریخی پسِ منظر

زمانۂ رسالت سے لے کر خلافت راشدہ کے آخری دور تک اسلام کا مقابلہ جاہلیتِ محضہ کے ساتھ تھا۔ یہ جاہلیت اگرچہ بڑی سخت جان تھی مگر اسلام کی نظریاتی اور عملی قوت کے مقابلہ میں اِسے ہر قدم پر شکست کھانی پڑی۔ دنیا کے جس حصہ میں بھی یہ اسلام سے متصادم ہوئی اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور بالآخر مقہور و مجبور ہو کر رہ گئی۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو چیز ایک دفعہ کتم عدم سے منظر وجود پر آگئی وہ دنیائے ہستی سے کبھی بالکلیہ فنا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس عالمِ رنگ و بُو میں ہر طرح کی چیز سما سکتی ہے اور متضاد و متخالف امور و حقائق کے لئے اس نے کبھی تنگیٔ دامان

کا عذر پیش نہیں کیا۔ بالخصوص ہر ایسی چیز جو انسانی طبائع کی مرغوب اور اہوائے النفس سے کچھ مناسبت رکھتی ہو۔ اُسے تو حضرت انسان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ کسی وقت اپنی ظاہری ہیئت و لباس کو بدل دے اور کسی دوسرے لباس میں دنیا کے سامنے آجائے مگر لباس کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ چنانچہ جاہلیت خالصہ جب ہر معرکۂ جنگ میں شکست کھاچکی اور ہر میدان کارزار میں بڑی طرح پٹ چکی یہاں تک کہ اس کا سیاسی اور اجتماعی وجود ختم ہوکر رہ گیا تو اس نے اپنے بقاء کے لئے اسلام کے دامن میں ہی پناہ لینی چاہی۔

اب وہ شخصیتیں اٹھ چکی تھیں جو اسلام کے حصن حصین کے لئے "باب مغلق" کا کام دے رہی تھیں اور اُن کی موجودگی میں باہر کی کوئی چیز اس قلعہ کے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھی۔

(ان بینك وبینھا بابا مغلقا) مگر جوں ہی یہ باب مغلق سامنے سے ہٹا تو جاہلیت نے اندر گھسنے کے کئی راستے بنا لئے۔ اب کیا تھا رسالت مآب صلعم کے ارشاد کے مطابق فتنوں کی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

انی لاری الفتن تقع فی بیوتکم کوقع المطر (بخاری) میں تمھارے گھروں میں فتنوں کی بارش دیکھ رہا ہوں۔

مگر پھر بھی جاہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے پہلے لباس میں اسلام کے سامنے آتی چنانچہ اب اس نے نیا چولا بدلا اور اسلام سے ساز و باز کرنی شروع کر دی کچھ دیا اور کچھ لیا اور بالآخر وہ اسلام سے جوڑ توڑ کرنے میں کامیاب ہوگئی اب وہ بظاہر دیکھنے والوں کو مسلمان نظر آتی تھی مگر باطن میں اسی طرح لات و منات کی چہیتی تھی!

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ دولتِ بنی اُمیہ کے آغاز سے آج تک برابر جاری رہا مگر یہ جاہلیت کمبخت اتنی زمانہ شناس واقع ہوئی ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں "احوال و ظروف" کے قالب میں ڈھلنے کی اِسے پوری مہارت حاصل ہے اس کے سامنے تو صرف ایک ہی مقصد رہا ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماع میں کس طرح اختلال کیا جاسکتا ہے؟ کس راستہ سے اس پر حملہ و ہجوم ہوسکتا ہے اور کس لباس سے اُسے اپنی جانب مائل کیا جاسکتا ہے؟ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے طرز و طریق بھی بدلتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کے انقطاع کے بعد سب سے پہلے اس نے ملوکیت و استبداد کا جامہ زیب تن کیا کیونکہ اس کے بغیر اس کا اثر و نفوذ کسی شکل میں بڑھ نہیں سکتا تھا اور یہی ایک چیز ہے جو ہر زمانہ میں جاہلیت کی پشت پناہی کرتی رہی ہے۔ بس ملوکیت کے

قیام کے ساتھ اس نے نقشۂ زندگی کے ایک ایک خانہ پر اپنا رنگ جمانا شروع کیا اور نظریۂ حکومت میں تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ہی اجتماع و تمدن کے تمام شعبوں میں انقلاب معکوس شروع ہوگیا۔

خلافت راشدہ کا عہدِ مقدس عہد رسالت سے مناسبتِ تامہ رکھتا تھا اور اس کا نظامِ فکر و عمل بالکل طریقِ سنت اور منہاجِ نبوت پر قائم تھا۔ یہی وجہ ہے سردار دوجہاں صلعم نے خلفار راشدین کے عمل و کردار کو لفظ سنت سے تعبیر فرمایا ہے۔

عن العرباض ابن ساریۃؓ قال رسول اللہ فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ

میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ اس کے ساتھ تمسک کرو اور نہایت مضبوطی سے اُسے پکڑلو۔

(اخرجہ ابوداؤد و ترمذی)

عن زید بن ارقمؓ قال

میں وہ چیز تم میں چھوڑ کر جارہا ہوں

قال رسول اللہ ﷺ
انّی تارک فیکم ما تمسکتم
بہ لن تضلوا بعدی
احدھما اعظم من الآخر
وھو کتاب اللہ حبل
ممدود من السماء الی
الارض وعترتی اھل بیتی
لن یفترقا حتّی یردا علیّ
الحوض مانظروا کیف
تخلفونی فیھا

(اخرجہ الترمذی)

کہ اگر تم اس سے تمسک کروگے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوسکوگے (اس چیز کے دو حصے ہیں) ایک ان میں سے دوسرے سے بڑا ہے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے اور دوسرا میری عترت یعنی اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کو میرے پاس حوض کوثر کے مقام پر وارد ہوں گے دیکھو تم لوگ ان دونوں سے میرے بعد کیا سلوک کرتے ہو۔

یہ دونوں روایتیں بظاہر الگ مفہوم رکھتی ہیں مگر درحقیقت ان کا مفہوم ایک ہی ہے احادیث نبوی میں جہاں خلفاء راشدین کا ذکر آیا ہے۔

ان میں اہل بیت بھی شامل ہیں اور جہاں عترت یا اہل بیت کا ذکر ہوا ہے اس میں خلفاء راشدین بھی داخل ہیں چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

گویا عترت اور اہل بیت سے مراد رسولِ خداصلعم کی روحانی اولاد ہے جو صحیح طور پر اپنے روحانی باپ کے نقش قدم پر چلنے والی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ دونوں حدیثیں اپنے منشاء کے اعتبار سے بعد کے مجددین ملت اور مصلحین اُمت پر بھی حاوی ہیں کیونکہ ان کا مسلک و طریق بھی خلفاء و اہل بیت کے مسلک کے عین مطابق ہے اور یہ مقدس ہستیاں گویا خلفاء الخلفاء ہیں لہذا اولاً و بالذات نہ سہی مگر بالتبع یہ بھی ان احادیث میں شامل ہیں۔

غرض خلفاء راشدین کا مقدس دور دینی، اخلاقی

سیاسی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بالکل عہدِ نبوت سے مشابہ
تھا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، صورت و سیرت، اخلاق
و معاشرت اور عمل و کردار میں رسالت مآب صلعم کے زندہ
نمونے تھے اور وہ جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو اپنے ہی
رنگ میں رنگ دیا ان کا کردار اور کیرکٹر دوسروں پر
اثر انداز ہوتا تھا مگر وہ خود کسی سے متاثر نہ ہوتے تھے
اور انھوں نے ہی دنیا کے انسانوں کو صحیح اسلامی فکر و
عمل اور سیاست و اجتماع سے روشناس کیا مگر
خلافت راشدہ کے انقطاع کے بعد زمام سیادت بنی اُمیہ
کے ہاتھ آگئی اور اس وقت سے اسلامی طرز سیاست
اور حریتِ اجتماع میں ایک ناخوشگوار انقلاب رونما ہوا
اب خالص اسلامی جمہوریت کے بعد ملوکیت و استبداد
کا دور شروع ہوا اور اس ظالمانہ طرزِ سیاست نے
اجتماع اسلامی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اگرچہ اس عہد
میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی مگر بقول

سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ "المسلک والدین توأمان"
یعنی دین کا قیام حکومت کے بغیر ممکن نہیں چونکہ قوتِ
مقتدرہ جن اشخاص کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی تھی
وہ انتہائی درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے
اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے اخلاق و معاشرت اور
اجتماع و تمدن پر سب سے زیادہ ملکی سیاست ہی
اثر انداز ہوتی ہے اس لئے صحابہ کرام کی مجاہدانہ
جدوجہد بھی اس سیلاب بلا کو نہ روک سکی۔

دور خلافت راشدہ میں آزادی فکر و رائے حریتِ
اجتماع اور مساوات عامہ کو جس قدر اہمیت حاصل تھی
اس سے اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی جرأتِ
انکار نہیں کرسکتا جس کی تفصیل میں "اسلامی نظریۂ سیاست"
میں کرچکا ہوں اور آئندہ ابواب میں بھی انشاء اللہ
اس پر بحث کی جائے گی مگر دورِ بنی اُمیہ کے آغاز
میں ہی طبقاتی نظامِ اجتماع اور ظالمانہ تمدن کی بنیاد

پڑگئی۔ وہی جاگیردارانہ سسٹم. شریف و وضیع کے امتیازات اور امیر و غریب کی تفریق جو اسلام کے دور اوّل میں ختم کردی گئی تھی مگر دوبارہ مسلمانوں کے طرز اجتماع میں داخل ہوگئی۔ افکار و عقائد میں فساد رونما ہونے لگا۔ اسلامی دستور اخلاق کو بدل دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے طرز و طریق میں تجدد کا سلسلہ جاری ہوا' شراب نوشی بدمستی' عیش کوشی' جبر و تشدد اور تمام ملوکانہ صفات بروئے کار آنے لگیں۔

مگر تاریخ اسلامی کی یہ ایک درخشندہ حقیقت ہے کہ وہ پرستاران ملوکیت اور داعیانِ تجدد و تلبیس کے ساتھ ساتھ مردان راہِ حق' داعیانِ حریت و آزادی' مجددینِ ملت اور مصلحین اُمت کی شاندار روایات پیش کررہی ہے۔ اگر ایک طرف خود مسلمانوں سے ہی کوئی جابر و قاہر اور مختار مطلق حکمراں پیدا ہوتا ہے جو اپنے ظالمانہ کردار اور تجدد پسندی سے جاہلی افکار

و اعمال کا احیاء کرتا ہے اور دینِ خداوندی کو ہوائے نفس کے ماتحت چلانا چاہتا ہے، یا فرق باطلہ کے فاسد عقائد سے عقائد اسلامی اور قرآنی طریقِ اجماع و سیاست میں تزلزل رونما ہونے لگتا ہے تو ساتھ ہی ایک پُر اسرار قوتِ روحانی کا حامل مردِ مجاہد بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو اپنی بے پناہ قوتِ عمل سے پرستاران باطل کے تمام منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور دین خداوندی کو سالہا سال کی آمیزشوں سے پاک کر کے تجدید ملت اور احیاء دین کے کٹھن مراحل کو ایک محدود عرصہ میں ہی طے کر جاتا ہے ؎

دگر قومے کہ ذکرِ لا الٰہ اش
برآرد از دلِ شب صبح گاہش
شناسد منزلش را آفتابے
کہ ریگِ کہکشاں روبد ز راہش

(اقبالؒ)

یہ ہے وہ حقیقتِ باہرہ جو اسلامی تاریخ کے ہر دور میں آپ کو نمایاں نظر آئے گی اور کیوں نہ ہو کہ خود سید الاولین والآخرین صلعم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ میں ظاہر فرما دیا تھا۔

ان اللّٰہ یبعث لھذہ الأمۃ علی رأسِ کل مائۃ من یجدد لھا دینھا۔ (اخرجہ ابوداؤد والحاکم فی المستدرک والطبرانی والبیہقی فی سننہ)	اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر سو سال کے خاتمہ پر کوئی ایسی جامع شخصیت بھیجے گا جو اِس اُمت کے دین کی تجدید کرے گی۔

یہ بحث اگرچہ ایک مستقل موضوع رکھتی ہے اور اس کے تفصیلی گوشے ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہیں مگر اجماع اسلامی کے فساد و اختلال کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علے وجہ التبعیت اس کا

ذکر بھی آجانا لازمی ہے۔

قریباً نصف صدی کے اس دورِ ضلالت و ملوکیت کے بعد خدائے قدوس نے بنی اُمیہ سے ہی ایک جلیل القدر شخصیت حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا۔ آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وراثت و جانشینی کے اُس جاہلی تصور کو مٹایا اور مجمع عام میں اعلان فرمایا۔

ایّھا الناس انی اُبتلیتُ بھذا الامر من غیر رایٍ منی ولا طلبةٍ ولا مشورةٍ من المسلمین وإنی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لانفسکم غیری	اے لوگو! مجھے میری رائے اور خواہش ۔نیز عام مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر ہی حاکم بنادیا گیا ہے اور اب میں اپنی بیعت سے تمھیں آزاد کرتا ہوں اور میرے سوا جس کو چاہو اپنا امیر بنالو۔

چنانچہ اسلامی طریقِ انتخاب سے ان کو ہی خلیفہ

چنا گیا اور اس طرح ملوکیت کا بت ان کے ہاتھوں سے چور چور ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد تجدید دین اور احیاء ملت کا کام شروع کیا۔ کتاب و سنت کے علوم کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ اسی زمانہ سے احادیث کی ترتیب و تدوین کی مہم شروع ہوئی ثقافت و تہذیب اسلامی کو غیر اسلامی آمیزش سے پاک کیا گیا، نظام تعلیم و تربیت اور فکر عامہ میں از سرِ نو اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہونے لگا اور تمدن کے تمام شعبوں کی کتاب و سنت کے مطابق تعمیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جاگیردارانہ نظام کا قلع قمع کر دیا گیا شاہی خاندان میں جس قدر جاگیریں تھیں وہ بیت المال کی ملکیت قرار دی گئیں، شاہ و گدا، امیر و غریب اور دیگر نسلی، وطنی اور قومی امتیازات کو مٹا کر از سرِ نو مساواتِ عامہ، حریت اجتماع اور آزادیٔ فکر کو رواج دیا گیا مگر افسوس کہ یہ کام ابھی تشنۂ تکمیل ہی تھا کہ عمر ثانی

کی عمر نے وفا نہ کی اور آپ رفیقِ اعلیٰ سے جاملے
اب مجدّد اول کی وفات کے بعد مستقل طور پر عنانِ اقتدار جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئی اور پھر آج تک دنیا کے کسی حصّہ میں کوئی پائدار اسلامی طرز کی حکومت قائم نہ ہوسکی، چونکہ مذہب اور اقتدار دونوں قوتیں لازم و ملزوم ہیں اس لئے تاوقتیکہ یہ دونوں یک لخت کسی جامع شخصیت کے ذریعہ عمل پذیر نہ ہوں دنیا میں نظم و امن کا قیام دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند (اقبالؒ)

مگر اب اقتدار نے مذہب سے پیچھا چھڑالیا اور جاہلیت کے راستہ میں اب کوئی رکاوٹ نہ رہی چنانچہ اب اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مختلف راستوں سے ملتِ اسلامیہ پر یلغار شروع کردی۔ ہر نئے دور میں ایک

نیا روپ بدل کر سامنے آئی اور جسدِ ملّی میں اس کا اثر و نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مگر حضرتِ مجدد اول نے اپنے ڈھائی سالہ دور خلافت میں فکر اسلامی کو جس سطح پر لا کھڑا کیا تھا اس کے دوررس نتائج کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی، اب ایک طرف جاہلیت کی قوتیں مصروف کار تھیں اور دوسری طرف مجدد اوّل کی نہضتِ علمی اور حرکت دینی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بنی اُمیہ کا دورِ استبداد ۱۳۲ھ تک قائم رہا اس عہد میں بہت سی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ (پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ) اور حضرت امام مالکؒ (پیدائش ۸۵ھ وفات ۱۷۹ھ) فکر و اجتہاد اور تبحر علمی کے اعتبار سے ممتاز درجہ

رکھتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ سلاطین و امرار کے
فکر و ذہن کو جاہلیت نے اس قدر ماؤف بنا دیا تھا
کہ اب وہ فکر اسلامی سے بالکل تہیدست ہو چکے تھے
اور کتاب و سنت کی اصل روح کو ہوائے نفس
کے تہ در تہ پردوں میں چھپا رکھا تھا اب اگر کوئی
مردِ خدا ان پردوں کو ہٹا کر روحِ اسلامی کو بےنقاب
کرنا چاہتا تو ملوکیت کی تمام طاقتیں اس کے خلاف
صف آرا ہو جاتیں حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت
سے لے کر اس وقت تک جاہلیت کے جتنے کارنامے
ہیں ان میں یہ رنگ زیادہ نمایاں رہا ہے۔ امرار کو
کچھ ایسے علمار مل جاتے تھے جو بندگان حرص و آز
اور سیم و زر تھے اور ان کی زبان سے اہل حق پر کفر کے
فتوے لگوائے جاتے تھے اور پھر ان کو قید و بند
میں ڈالا جاتا۔ کوڑوں سے پیٹا جاتا۔ قتل کی دھمکیاں دی
جاتیں۔ غرض وہ سب کچھ ہوتا رہا جو اہل حق کو اعلار

کلمۃ الحق کے صلہ میں ارباب جوہر کی طرف سے بطور انعام مل سکتا ہے۔ مگر ان مردانِ خدا نے اس راہ میں خوف و طمع کی تمام زنجیروں کو پاش پاش کرکے رکھدیا قید و بند کی صعوبتیں اور کوڑوں کی بارش بھی ان کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہ کرسکی۔

بناکردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اور دولت و ثروت، جاہ و عزّت کے مژدے بھی سنائے گئے مگر ان مردانِ راہ حق کو کوئی چیز جادۂ مستقیم سے نہ پھیر سکی۔

یہ دونوں جلیل القدر امام بنوامیہ کے عہد میں پیدا ہوئے اور عہد عباسی میں ان کی وفات ہوئی۔ یہی وہ مقدّس نفوس تھے جن کی طبع رسا اور نظر حق شناس نے قرآن وحدیث کے غوامض و اسرار کو آشکارا کیا اور فکر و اجتہاد اور اخذ و استنباط کے ذریعہ احکام وشرائع

قوانینِ سیاست اور نظامِ اجتماع و تمدن مرتب کیا۔

یہ دونوں اصحاب علمی سیاسیات اور ارباب سیاست سے الگ تھلگ رہے اور ان کی علمی کاوشیں کسی امیر و سلطان کی رہینِ منّت نہ ہوئیں بلکہ ان کی طبعِ غیور نے انھیں سلاطین کی منت پذیری سے ہمیشہ بے نیاز رکھا۔ کئی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، کئی انقلاب آئے سلاطین کی باہم رقابتوں نے خدا کی زمین کو تہ و بالا کردیا مگر یہ مردانِ حق شناس اپنے مقام و موقف پر قائم رہے۔

جہاں تک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے ان دونوں حضرات کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ مدینۂ منوّرہ میں جب حضرت امام حسنؓ کے پڑپوتے محمد مہدی نے خلافت کا دعویٰ کیا تو منصور عباسی کی ایک بہت بڑی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کردی محمد مہدی کے پاس تھوڑی سی فوج تھی جب انھوں نے دیکھا کہ کامیابی کی کوئی اُمید نہیں تو انھوں نے اپنے لشکریوں سے فرمایا کہ جو لوگ

اپنی جان بچانا چاہتے ہیں وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ اب صرف تین سو شہسوار رہ گئے مگر خاندان سادات کے چشم و چراغ محمد مہدی کی تلوار نے ہی ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ اُتارا مگر آخر شکست کھائی۔ اس لڑائی میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے محمد مہدی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ان حضرات کو سخت سزائیں دی گئیں امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں ان کو زہر دلایا گیا اور امام مالکؒ کے کوڑے لگائے گئے اور ان کی مشکیں کسی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک بازو بھی ٹوٹ گیا۔

غرض ۱۳۲ھ سے عباسیوں کا دورِ امارت شروع ہوا۔ اور بدقسمتی سے یہ لوگ امراء بنی امیہ سے بھی گئے گزرے تھے۔ اور اس کے ساتھ اس دور میں جاہلیت نے یک لخت ہی کئی روپ دھار لئے۔ امراء

نشۂ اقتدار میں بدمست تھے لادینی اور لامذہبیت کا ایک تلاطم خیز سمندر امڈ کر آگیا اور اسلامی نظامِ فکر و عمل پر ہر طرف سے یورش ہونے لگی

خاندانِ سادات کے چھٹے امام حضرت امام جعفر صادقؒ تک شیعہ فرقہ میں اتحاد رہا۔ مگر ان کے بعد یہ فرقہ دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک بڑا گروہ حضرت موصوف کے بڑے بیٹے حضرت امام کاظمؒ کو امام ماننے لگا اور کچھ لوگ ان کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کو امامت کا حقدار تسلیم کرنے لگے۔ ثانی الذکر گروہ اسماعیلی فرقہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اور یہ گروہ پھر دو گروہوں میں منقسم ہوگیا ایک گروہ وہ تھا جو اپنے عقائد لوگوں سے چھپاتا تھا اور اندرونی طور پر اپنے خیالات کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف تھا یہ گروہ باطنی فرقہ کے نام سے مشہور تھا اس گروہ نے سارے ملک میں تبلیغ کا وسیع جال پھیلا دیا تھا۔ اور دوسرا گروہ

جو قرمطی کہلاتا تھا وہ اگرچہ اتنا منظم نہ تھا مگر اس کے ماننے والے بڑے دلیر اور بہادر تھے۔ علم کلام میں ان فرقوں کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ ان کا مذہب دراصل اسلام اور مجوسیت سے مرکب تھا کیونکہ یہ لوگ ایرانی الاصل تھے اس لئے ایران کے قدیم مذہب، اور تہذیب و تمدن کا ان کے خیالات پر گہرا اثر تھا۔

باطنی فرقہ کا بانی ایک شخص عبداللہ ابن میمون قداح نامی تھا اس نے بیت المقدس میں اپنی تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور اپنے آدمی جگہ جگہ بٹھائے ہوئے تھا جو کبوتروں کے ذریعہ اس کو خبریں پہنچاتے تھے اس بنا پر لوگ اس کے معتقد ہو گئے تھے۔

ان فرقوں کے علاوہ فرقۂ معتزلہ نے بھی اسی دور میں عروج حاصل کیا یہ لوگ ایک نئے فلسفیانہ مذہب کے موجد تھے اور انھوں نے دین خداوندی میں

دل کھول کر تحریف کی، یہاں تک کہ فکر اسلامی کی پوری عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اور پھر بات یہیں تک ختم ہوجاتی تو خیر تھی مگر اس سے بڑھکر جاہلیت نے ان لوگوں پر بھی دست درازی شروع کر دی جو اہل السنت کہلاتے تھے اور علم و فضل میں کمال رکھتے تھے انھوں نے ان نئے فرقوں کے دفاع و مقابلہ کے لئے اسی قسم کے جاہلی ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے اور یونانی فلسفہ کے اوہام و خرافات کو افکارِ اسلامی کے ساتھ مخلوط کر دیا چنانچہ اس عہد کی کتب تفسیر اور دیگر اسلامی لٹریچر بھی ان نئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مگر اس دورِ جاہلیت میں بھی اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوئے جنھوں نے جاہلیت کے اس بے پناہ ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا ان میں امام اجل حضرت احمد ابن حنبل، امام شافعی اور امام ابو عبداللہ محمد

ابن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہم کے اسماء گرامی
قابل ذکر ہیں۔

جاہلیّت کا نیا بھیس

اس سے پہلے عرض کر آیا ہوں کہ ملوکیت و استبداد نے جب بھی اہل حق کو کچلنا چاہا تو اہل علم میں سے ہی کچھ بندگانِ حرص و طمع کو دولت و جاہ کا لالچ دے کر خریدا اور جو کچھ اُمراء و سلاطین خود نہ کر سکتے تھے وہ اُن سے کرایا اور جس بات کے کہنے کی وہ خود جرأت نہ کر سکتے تھے وہ ان سے کہلوائی اور ان علمبردارانِ شریعت حقہ نے اپنے آقایان نعمت کے اشاروں پر وقت کے حق پرست لوگوں پر کفر کے فتوے صادر کر کے ان کو طرح طرح کے رنج و بلا میں ڈالا۔ مگر ان کی آواز دراصل امراء و ملوک کی آواز تھی۔

میں اُن کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات اُنکی

ہمارے لئے اُن مصائب و آلام کا تصوّر بھی صبر آزما حد تک تکلیف دہ ہے جو ان مردانِ راہ حق کو اعلاء کلمۃ الحق کی راہ میں علماء سو کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے یہ بہت بڑی افسوسناک اور رنجیدہ داستان ہے جس کے سننے کے لئے بھی پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔

حدیثِ درد دل آویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

حضرت امام احمد ابن حنبل (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) جن کا نام زبان پر آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کے جذبات امڈ آتے ہیں ایک بہت بڑے امام حدیث اور مجدد دین تھے۔ اسلام کے اس بطل جلیل اور علمبردار علوم نبوت کو زندگی کے جن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا ہماری طرح کے کمزور و نحیف لوگ اس کا تصوّر بھی مشکل سے ہی کر سکتے ہیں مگر خدا کو جن لوگوں سے کام لینا

منظور ہوتا ہے ان کی ذہنی اور جسمانی بناوٹ بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔

حضرتِ امام نے چار عباسی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اپنے جسمِ اطہر پر ظلم و تشدد کے پہاڑ گرتے ہوئے بھی دیکھے اور پھر عقیدت و محبت کے پھولوں کی بارش بھی دیکھی۔ یہ دونوں حالتیں اگرچہ صبر شکن تھیں مگر کیا کہنے ان اللہ والوں کے کہ کسی حالت میں اپنے دامنِ بے نیازی کو دنیاوی نجاست سے ملوث نہ ہونے دیا۔ جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ اپنی جان کا سودا کرلیا وہ کسی نفع و سود کے متلاشی نہیں ہوتے۔

دل دادم و جاں دادم و ایماں دادم
سود است و بے سود نمی دانم چیست

غرض ان چار بادشاہوں میں سے مامون، معتصم اور واثق کے زمانہ میں حضرت امام پر شدائد و مظالم کی حد کردی گئی انسان تو انسان ہے پہاڑ بھی ان مصائب

کی تاب نہ لاسکیں مگر سرمستانِ خمخانۂ احدیت کے رنگ ہی نرالے ہیں ان کے آہنی عزم کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کرسکی اور وہ اس دنیا کی فانی لذات، حیات دینوی کی پرفریب چمک دمک، شاہوں کے جلال و جبروت اور طلسمِ زخارف پر لات مار کر صرف نصبِ حیات کی تکمیل میں مصروف سعی رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مقامِ بلند اُن خوش بخت اور نیک طالع انسانوں کو ہی میسّر آتا ہے جن پر خدائے قدوس کی خاص نظرِ التفات ہوتی ہے۔

بلندمرتبہ زاں خاکِ آستاں شدہ ام
غبارِ کوئے توام گر بہ آسماں شدہ ام

امامِ موصوف کی نسبت خود ان کے ہی معاصرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ آپ کے عزمِ بلند کے سامنے بادشاہوں کا جاہ و جلال دنیا کی ہر چیز سے حقیر تھا ابراہیم ابن

مصعب کوتوال کہتے ہیں کہ میں نے بادشاہوں کے آگے احمد سے زیادہ کسی کو دلیر اور نڈر نہیں پایا ان کے الفاظ ہیں

یومئذٍ ما نحن فی عینہ الا کامثال الذباب۔ | کارپردازانِ حکومت ان کی نظر میں ایسے تھے گویا ان کے سامنے مکھیاں بھنک رہی ہیں

بشر حافی جو اس زمانہ کے بہت بڑے عابد و زاہد تھے فرماتے ہیں کہ جب امام احمد کو قید کر کے پا بزنجیر طرطوس روانہ کیا گیا تو ابوبکر لاحول نے سوال کیا اِنْ عرضت علیك السیف تجیبُہ ؟ اگر تم پر تلوار پیش کی جائے تو مان جاؤ گے ؟ فرمایا "لا" ہرگز نہیں۔

بشر حافی سے کہا گیا کہ آپ ان کی سفارش کیوں نہیں کرتے تو فرمایا مجھ میں اِن مصائب کے تحمّل کی قوت نہیں۔ قام احمد مقام الانبیاء۔ احمد تو انبیاء کے مقام پر کھڑا ہے۔

اس مردِ خدا کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ حسن ابن عبدالعزیز نے ہزار ہزار روپیہ کی تیس ۳۰ تھیلیاں آپ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا یہ مال مجھے ترکہ میں ملا ہے اور بالکل طیب ہے آپ اسے قبول فرمالیں، تو فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں میرا مالک مجھے رزق دے رہا ہے۔

جب متوکل کا زمانہ آیا تو صورتِ حال بدل گئی ظلم و تشدد کی جگہ انعام و اکرام کی بارش شروع ہوگئی تو یہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھے ہٰذا امر اشدُّ علی من ذالک۔ یہ عقیدت و محبت کا جال میرے لئے کوڑوں کی مار اور قید سے زیادہ سخت ہے

حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) بھی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے فکر و اجتہاد اور فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے نمایاں کام کیا مگر حکومتِ وقت نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور یمن سے بغداد تک

انھیں پا بہ زنجیر لایا گیا۔

امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) کے تفقہ فی الدین اور تبحر علمی سے ساری دنیا روشناس ہے یہ جلیل القدر امامِ حدیث جب فراغتِ علم کے بعد اپنے وطن بخارا تشریف لائے تو حکومتِ بخارا کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا مگر چند دن ہی قیام کیا تھا کہ امیر بخارا ان کی بے نیازی و استغنا اور بیباکانہ تبلیغ سے چلّا اٹھا امام بخاری سے مطالبہ کیا کہ آپ شاہی محل میں تشریف لاکر شاہزادوں کو درس حدیث دیا کریں مگر امام صاحب نے جواب دیا ایسا نہیں ہوگا اگر خواہش ہو تو بچوّں کو میرے پاس بھجدیا کرو مگر امیر نے کہا کہ اچھا پھر اتنا ضرور کرو کہ جب میرے بچے تعلیم کے لئے آپ کے پاس آئیں تو اس وقت کسی جولاہے، موچی کا لڑکا وہاں بیٹھنے نہ پائے مگر علوم نبوت کا یہ عالم متبحر اور اسلامی نظامِ حیات کا شارح یہ کیونکر برداشت کرسکتا تھا کہ ان

کے حلقۂ درس میں امیر و غریب اور شریف و ذلیل سے
جدا جدا سلوک ہو۔ انھوں نے صاف جواب دیا کہ علم
حدیث وراثت رسول ہے کسی شاہ و امیر کی جاگیر نہیں یہاں
تو شاہ و گدا اور امیر و غریب ایک ہی صف میں بیٹھیں
گے۔ اس بات پر امیر سخت ناراض ہوا اور علماء سُو کے
توسط سے آپ پر کفر کے فتوے لگائے گئے آخر امام صاحب
کو اپنے وطن مالوف سے ہجرت کرنی پڑی اور سمرقند
کے ایک گاؤں میں پہنچے جہاں انھوں نے بعد نمازِ عصر
بارگاہ رب العزت میں بصد عجز و نیاز یہ دعا کی

اے خداوندا تیرے اس بندے پر زمین کی
وسعتیں تنگ آگئی ہیں اب تو اِسے اپنے پاس بلالے
چنانچہ چند دنوں میں ہی اس دعا نے اثر دکھایا
اور آپ نے اسی گاؤں میں فرشتۂ اجل کو
لبیک کہی

انا للہ و انا الیہ راجعون

غرض عباسیہ کا دور حکومت ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ یعنی پورے پانصد سال تک، جاری رہا اور اس کے بعد مصر میں اس خاندان کے کچھ افراد نے ۹۲۳ھ تک حکومت کی مگر دور بنی اُمیہ کے آغاز میں جس فتنۂ جاہلیت نے سر اٹھایا تھا وہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا جاہ و جلال تیسری صدی کے اختتام تک زوروں پر رہا مگر اس کے بعد باہم سیاسی اختلاف و نزاع کی وجہ سے اسلامی سلطنتوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گئی۔ بیرونی طاقتیں بھی سر اٹھانے لگیں خلافت عباسیہ کی شوکت ایک افسانہ بن گئی۔ ہسپانیہ کی حکومت کا بھی یہی حال تھا ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی انتہائی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ مراکش سے بخارا تک مسلمان ہی مسلمان تھے مگر ان میں کوئی موثر طاقت نہ تھی۔ دوسری طرف قرامطہ کا فتنہ زوروں پر تھا ان حالات میں خدائے قدوس

نے کچھ مردانِ حق کو پیدا کیا جنھوں نے اصلاح ملّت اور
تجدید دین کا بیڑا اٹھایا ان میں ایک حضرت شیخ محی الدینؒ
ہیں جنھوں نے چوتھی صدی میں اندرونی اور بیرونی فتنوں
کے سدباب کے لئے زبردست کوشش کی۔ تمام دنیا میں
اپنے خلفاء کو پھیلا دیا اور ان کی بے لوث کوششوں
سے پانچویں صدی میں مسلمانوں کی قوت و شوکت پھر
نصف النہار پر پہنچ گئی۔

دوسری طرف امام غزالیؒ نے قلمی جہاد کے ذریعہ
فلسفۂ یونانی کے بڑھتے ہوئے الحاد اور فرق باطلہ کی
فتنہ انگیزیوں کا زبردست مقابلہ کیا اور اپنے مخصوص
رنگ میں اسلامی نظریۂ حیات کی شرح کی۔ اس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ دہریت و الحاد کا وہ سیلاب عظیم جو عام
مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جارہا تھا
رک گیا اور صحیح اسلامی فلسفۂ حیات کا رنگ ابھرنے
لگا۔

اسی طرح امام ابن تیمیہؒ جو ساتویں صدی کے ایک بہت بڑے بلند پایہ عالم سنت اور فاضل اجل تھے نے بھی اس زمانہ کے اعتقادی اوہام و خرافات کا نہایت عزم و استقلال سے مقابلہ کیا اور اسلام کے عقائد و افکار اور نظام اجتماع و تمدن میں اس وقت تک جسقدر مشرکانہ اثرات پیدا ہو چکے تھے ان کو ایک ایک کر کے نکالا۔ اور خالص اسلامی نظام فکر و عمل مرتب کیا اور ان کی فاضلانہ تصانیف نے عالم اسلامی کے اعتقادی ناسور کے لئے نشتر کا کام دیا۔ مگر انھوں نے صرف علمی جہاد پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس وقت کی سب سے بڑی قاہرانہ طاقت یعنی تاتاری وحشت کے مقابلہ میں جہاد بالسیف بھی کیا۔

لاتنال بغیر السیف منزلۃٌ
ولا تردُّ صدور الخیل بالکتبِ

غضب یہ ہے کہ یہ تمام مقدس اور پاک ہستیاں

علمائے سُو کے فتاوائے کفر کی زد سے نہ بچ سکیں اور وقت کے اربابِ سیاست نے ان کی حق پرستانہ آواز کو کچلنے کے لئے ان بندگانِ سیم و زر کو ہی آگے بڑھایا حالانکہ یہ ہستیاں اگر نہ ہوتیں تو آج قانون شرعی کے مناہج و طرق، فقہِ اسلامی۔ احکام و قضایا کی تفاصیل اور علوم سنت سے ہم بے بہرہ ہوتے۔

گر گفتۂ زعشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتیت کہ ازیں شنیدہ

ہندوستان میں اسلام وجاہلیّت کی ٹکّر

اسلام کے دور اوّل میں عرب تاجروں کے قافلے ہندوستان میں آئے۔ مالا بار اور کالی کٹ کی سرزمین نے سب سے پہلے ان کا خیرمقدم کیا۔ چوں کہ ان لوگوں پر اسلامی نظریۂ اجتماع و مدنیت کا گہرا اثر تھا اس لئے ان کی سادگی، خلوص، اور بلند اخلاق نے ان علاقوں کے باشندوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ دیانت و امانت اور عمل و کردار کی عمدگی کی وجہ سے ان کا اثر و نفوذ اس حد تک بڑھا کہ ہندو راجے بھی ان کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان علاقوں میں اسلامی تہذیب و مدنیت کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے۔ بنی اُمیہ کے زمانہ میں

محمد ابن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس نے ہندو راجاؤں کو شکست دی مگر بنی امیہ کے نزدیک اِن علاقوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی اس لئے محمد ابن قاسم کو واپس بلایا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام محمد غوری کے غلاموں کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ جن کا پہلا حکمران قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا یہ خاندان اصل و نسل کے اعتبار سے ترکی تھا اس وجہ سے اس میں نسلی شرافت، سادگی اور شجاعت و بسالت تو طبعی تھی مگر اسلام نے ان میں عدل و رواداری اور کچھ بلند نظری بھی پیدا کر دی تھی اس کے بعد کئی خاندانوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور حق یہ ہے کہ دبدبۂ و شوکت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے ان میں کوئی کمی نہ تھی البتہ اگر ان میں کوئی کمی تھی تو وہ یہ کہ اسلام کی اصل روح سے بہت حد تک نابلد تھے اگرچہ بعض حکمراں ایسے

بھی ہوئے ہیں جو فطرۃً صالح اور نیک نہاد تھے مثلاً ناصر الدین محمود اور مغل شہنشاہ عالمگیرؒ وغیرہ مگر افسوس کہ صحیح اسلامی نظامِ سیاست و اجتماع کے نفاذ و اجراء کی ان کو بھی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اس ملک میں اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کی اگر کوئی کوشش ہوئی تو وہ صرف اولیاء اللہ اور علماء حق کے ذریعہ سے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ پیشاور کے راستہ سے آئے۔ لاہور اور دھلی سے ہوتے ہوئے اجمیر کو اپنا مرکز تبلیغ بنایا انھوں نے اپنے خلفاء کو ملک کے کونے کونے میں بھیج دیا خواجہ قطب الدین بختیارؒ کو دہلی میں متعین کیا۔ خواجہ فرید گنج شکرؒ کو پاکپٹن میں اور جلال الدین تبریزی نے بنگال میں اشاعتِ دین کا سلسلہ جاری کیا۔ ان حضرات کی تبلیغی جدوجہد سے ہندوستان میں کسی حد تک شعائرِ اسلامی نے رواج پایا۔

جاہلیت کا نیا کارنامہ

ہندوستان کی سرزمین ہر بات میں نرالی واقع ہوئی ہے جو بات دنیا کے کسی کونے میں دیکھی اور سُنی نہ جا سکتی ہو اُسے ہندوستان میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے اس سے پہلے امرار بنی امیہ ہو یا شاہانِ عباسیہ، حکومتِ مصر ہو یا سلطنتِ ترکیہ سب میں ایک امر مشترک ضرور تھا کہ وہ خالص اسلامی فکر و نظر اور طریقِ اجتماع و سیاست سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مستغنی تھے اور جاہلی فکر و عمل نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر جمایا ہوا تھا۔ مگر اب تک اتنی بات تھی کہ مسلم قومیت کو ایک مشخص اور مستقل بالذات حیثیت حاصل تھی جس کی بنا، صرف اسلام کے بنیادی افکار و اعمال پر تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلامی

فکر و عمل میں بھی ان لوگوں نے بہت کچھ ہیر پھیر کردیا تھا تاہم برائے نام ہی مگر مسلم قومیت کا داعیۂ اتحاد اب تک اسلامی عقائد و اعمال ہی متصور ہوتے تھے مگر ہندوستان کے شہنشاہ اکبر (دی گریٹ امپائرر) نے یہ کسر بھی پوری کردی اور ایک نئی "ہندی قومیت" کی بنیاد رکھی اس تصورِ قومیت نے اسلام کے مخصوص نظامِ اجتماعی کو سخت نقصان پہنچایا اور جسدِ ملّی کے جوڑ جوڑ کو مضمحل کردیا اس کی پوری تفصیل تو آگے کسی موقع پر آئے گی لیکن یہاں صرف اس قدر عرض کردینا ضروری ہے کہ بمقتضائے "لِکُلِّ فرعونٍ موسیٰ" جب متحدہ قومیت کا ایک نیا بت تراش لیا گیا تو خدا نے اسی جنم بھومی میں ایک مردِ حق بیں کو بھی پیدا کردیا جس کے عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب سے یہ صنمِ اکبر پاش پاش ہوکر رہ گیا۔

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

میری مراد حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ سے ہے جنھوں نے صرف علمی جہاد ہی نہیں کیا بلکہ وقت کی برسر اقتدار۔ طاقت نے آپ کو قید و بند اور ہر قسم کی بلا و آزمائش میں ڈالا۔ مگر ان کے عزم و ہمت میں بال برابر بھی فرق نہ آسکا

عشق بازی را تحمل باید اے دل عشقباز
گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

عالمگیرؒ کی موت کے بعد سلطنتِ اسلامی حالت نزع میں مبتلا ہوگئی ایک نیم مردہ جسم تھا جس میں مدافعت کی طاقت باقی نہیں تھی مگر مرتے مرتے بھی اس سخت جان نے کافی عمر حاصل کرلی۔ اندرونی خلفشار اور خلاف و نزاع نے اسے کھوکھلا کردیا تھا مگر آخری سانس تک افتاں و خیزاں قدم بڑھاتی چلی گئی مگر تابکے ؟ آخر گری، تڑپی اور جان دے دی۔

اس آخری دور میں کئی مردانِ حق شناس پیدا

ہوئے ان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے اسمار گرامی قابلِ ذکر ہیں ان حضرات نے خالص اسلامی رنگ میں اسلامی نظریۂ حیات کو بروئے کار لانے کی مجاہدانہ جد و جہد کی ان کی علمی کاوشوں اور سرفروشانہ سرگرمیوں نے اگرچہ وقتی طور پر کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کی مگر ملتِ اسلامی کی تعمیر فکر میں ان کو کافی دخل ہے۔

یہ دور صرف مسلمانانِ ہند کے لئے منحوس نہ تھا بلکہ تمام عالمِ اسلامی ایک خطرناک انقلاب کے دروازے پر کھڑا تھا اور تمام اسلامی سلطنتیں اسی آگ کے شعلوں کی زد میں آگئی تھیں۔

دول یورپ مسلمانانِ عالم کی مرکزیت کو نیست و نابود کرنے کے لئے کس طرح لگاتار کوششیں کرتی رہیں اور کس طرح وہ اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیاب ہوئیں؟ یہ تاریخ عالم کا ایک افسوس ناک باب ہے جس کے لئے الگ

کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر اِن سے زیادہ افسوس ناک خود مسلمانوں کا نامۂ اعمال ہے جس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ اغیار کی ریشہ دوانیاں تو زمانۂ رسالت سے جاری رہیں مگر جب تک مسلمانوں کا قومی کردار مضبوط و مستحکم رہا اس وقت تک وہ ہر بیرونی طاقت کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے اور جو طاقت ان سے ٹکرائی وہ خود پاش پاش ہوکر رہ گئی۔ مگر دنیائے اسلام کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا جب کہ پہلی دفعہ ملّت اسلامیہ کی "بنیان مرصوص" میں رخنہ پیدا ہوا۔ یہی وہ خطرناک فتنہ تھا جس کی نسبت خود آنحضرت صلعم نے پہلے سے خبر دی تھی۔

التی تموج کموج البحر (بخاری) جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا آئے گا اور مسلمانوں کے قومی کردار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جائے گا۔ مگر پھر بھی جب تک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں اسلامی نکردعمل کا

کم سے کم حصہ بھی موجود رہا تمام دنیا پر فرمانروائی
کرتے رہے ان کی افواج نے دنیا کا چپّہ چپّہ چھان
مارا اور جو لوگ اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کرنے کیلئے
آگے بڑھے وہ خود ہی اس کے آگے سرنگوں ہوگئے
مگر اُنیسویں صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام کو ایسے
سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ ان کی تاب نہ لاسکے
لیکن نہایت رنج و افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عالم اسلامی
کی تباہی و بربادی میں اغیار کی فتنہ انگیزیوں کو اتنا
دخل نہیں جتنا کہ غدارانِ ملّت کی دسیسہ کاریوں
کو ہے۔

من آنچہ دیدہ ام زدل و دیدہ دیدہ ام
گاہے زدل کنم گلہ گاہے ز دیدہ ام

اس سلسلہ میں اسی زمانہ کے بطل جلیل، اور
مدبر اعظم علاّمہ جمال الدین افغانیؒ کے ایک مضمون کا
ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوسکے

گا کہ اس زمانہ میں دنیائے اسلام کن مصائب سے دوچار ہو رہی تھی اور ان مصائب کی زیادہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

علّامہ افغانی کا ایک مضمون

شاہ سلطان حسین کے زمانہ میں روسی جب اصفہان پر حملہ آور ہوئے تو عثمانیوں نے روس کی حمایت کی بلکہ ایران کے مقابلہ میں روس کو امداد بہم پہنچائی گئی یہ کتنا احمقانہ فعل تھا اور انھوں نے اتنا بھی محسوس نہ کیا کہ روس ترکوں کے ساتھ آج تک کیا معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ ترکی مقبوضات مثلاً بلغاریہ، یونان اور رومانیہ میں اس نے کیا ریشہ دوانیاں شروع کر رکھی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ روس آذربائیجان کے کئی مقامات پر قابض ہو گیا۔

عباس مرزا جب روس کے ساتھ لڑ رہا تھا تو عین

اسی زمانہ میں ترکوں نے ایران سے جنگ چھیڑ دی اور اس مداخلت کی وجہ سے روس آذربائیجان کے کئی شہروں پر قابض ہوگیا سلطان ٹیپوؒ کا سفیر دربارِ ترکی میں گیا اور اس نے سلطان کی طرف سے یہ پیشکش کی کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے عوض بصرہ ان کے حوالہ کیا جائے مگر ترکی نے اس پر توجہ نہ دی اور سفیر ناکام واپس آگیا سلطان ٹیپوؒ کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کا ہندوستان میں اثر و نفوذ پیدا ہوجائے اور انگریزوں کی قوت کو توڑا جائے اگر ترک اس وقت اس پیش کش کو مان جائے تو آج دنیا کا نقشہ شاید کچھ اور ہی ہوتا۔

جس زمانہ میں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریز کے تسلّط سے نکالنے کی جدوجہد شروع کی اور ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو فتح علی شاہ ایران نے انگریز کو خوش کرنے کے لئے افغانستان کو چیلنج کردیا۔ مگر اس نے اتنا بھی غور نہ کیا کہ افغانیوں کے خلاف انگریز کے ہاتھ

مضبوط کرنا خود ایران کے لئے کس درجہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے

امیر دوست محمد خاں والی افغانستان نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا اور پھر انگریز کے طلسم میں گرفتار ہوکر رنجیت سنگھ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ دیا اگر دوست محمد خاں میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو رنجیت سنگھ سے ہر قیمت پر تعاون کرتا کیونکہ پنجاب کی حکومت افغانستان کو انگریزی خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔

اس طرف ہندوستان میں نواب بنگال اور نواب کرناٹک اغیار کے آلۂ کار بن گئے۔ نواب لکھنؤ نے تیموری سلطنت کو ضعف پہنچایا۔ نواب دکن نے ٹیپو شہید کے مقابلہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔

اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے اپنی خود مختاری کے لالچ میں ترکوں سے بغاوت کی اور یورپ کے بنیوں سے گراں

شرح سود پر قرضہ لیا اور اس طرح ملک کو انگریز کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس مضمون میں علامہ افغانیؒ نے جن دردناک واقعات کا ذکر کیا ہے ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں دراصل علامہ کی سرفروشانہ سرگرمیاں اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جو عالمِ اسلامی کے لئے انتہائی یاس انگیز دور تھا۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلّط ہورہی تھی۔ ترکی کو تباہ کرنے کے لئے دول یورپ کی دسیسہ کاریاں مسلسل جاری تھیں الجیریا، ٹیونس اور مراکو پر فرانسیسی انقلاب چھا چکا تھا۔ طرابلس اٹلی کے چنگل میں گرفتار تھا اور دوسری طرف روس، بخارا اور آذربائیجان پر قبضہ جمارہا تھا۔ یہ حالات تھے جن سے تمام دنیائے اسلام دو چار ہورہی تھی اور پُرآشوب، دور میں تنہا علامہ افغانیؒ کی آواز بدامنی و بے چینی کی ان فضاؤں میں گونج رہی تھی۔

اب ظاہر ہے کہ اقوام غالبہ جہاں انسانوں کے اجسام پر حکومت کرتی ہیں وہاں ان کے اذہان و افکار کو بھی ایک خاص قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں اور مفتوح اقوام کے فکری اور ذہنی قویٰ میں وہ نظم و ربط باقی نہیں ہوتا اور نہ ہی اجتماعی احساسات میں وہ قوت موجود ہوتی ہے جو خارجی اثرات کے لئے مانع ہوسکے ورنہ ظاہر ہے کہ جب تک قوموں کے ذہنی قویٰ میں ربط و تسلسل اور اجتماعی احساسات میں قوت و استحکام موجود رہتا ہے اس وقت تک وہ اغیار کے غلبہ و تسلّط کو قبول ہی نہیں کرتیں۔

چونکہ اس دور میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا تھا اس لئے اقوام غالبہ کے جاہلی تصوّرات تو انھوں نے نہایت آسانی کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا اور ان کے نظام اجتماع و تمدن میں اسلامی نظریۂ حیات کا جو تھوڑا بہت اثر باقی تھا وہ بھی زائل ہونے لگا

اور مسلمان عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔

آئندہ صفحات میں ہم کتاب و سنت کی روشنی میں ان قومی اور اجتماعی تصوّرات کا ذکر کریں گے جو دوسری اقوام کے اثر سے مسلمانوں میں نفوذ کر چکے ہیں اور اسلامی نظامِ اجتماع و تمدن سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔

اقوامِ حاضرہ کے نظریہ ہائے اجتماع

اس سے پہلے کہ عصر حاضر کے نظریۂ ہائے اجتماع پر الگ الگ کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عمومی نقطۂ نظر سے ان کے واعیات اجتماع پر تبصرہ کردیا جائے

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دو قسم کی ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں مادّی اور روحانی لیکن انسان کی عجلت پسندی اور غرض پرستی ہمیشہ مادّی ضرورتوں کو روحانی ضرورتوں پر ترجیح دیتی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ صرف اسی نقطۂ نظر کے تحت آج تک انسانی وحدتیں (یونٹیز) وجود میں آتی رہی ہیں انبیاء و رسل اور ان کے سچے متبعین کے سوا کسی نے ثانی الذکر ضرورتوں کا احساس نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ مادّی ضرورتوں کا احساس جب

حد اعتدال سے بڑھ جائے یہاں تک کہ روحانی احساس ان میں گم ہوکر رہ جائے یا مادی تقاضے اس احساس پر غالب آجائیں تو اس حالت کو قرآنِ حکیم نے "ہوائے نفس" اور شہوات سے تعبیر کیا ہے۔

ولئن اتّبعتَ اھوائھم بعد الذی جاءك من العلم مالك من اللّٰہ من ولیّ ولا نصیر (بقرہ)۔

اے نبیؐ! اگر آپ یہود و نصاریٰ کی مادہ پرستانہ خواہشات کی پیروی کریں گے تو خدا کے مقابلہ میں آپ کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا

فخلفَ من بعدھم خلف اضاعوا الصّلوۃ واتّبعوا الشّھواتِ۔ (مریم ۴)

ان کے بعد ایسے نالائق خلف پیدا ہوئے جنہوں نے فریضۂ نماز (روحانیات) کو چھوڑ دیا اور شہواتِ نفسانی (مادیات) کی پیروی کرنا شروع کردی

فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب یأخذون عرض ھذا الأدنی ویقولون سیغفر لنا۔ (اعراف ۲)

ان کے بعد ایسے لوگ کتاب اللہ کے وارث بنے جو حیات دنیوی کے متاع پر مٹنے لگے اور دعویٰ یہ کہ ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا۔

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس نے مادیت اور روحانیت میں توازن قائم کر دیا ہے اور اس کے فلسفۂ حیات کے تمام اجزار، سیاست و عمرانیت، اقتصاد و معشیت، تہذیب و تمدن اور مذہب و روحانیت باہم اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ پر قائم رہنا امن عالم کے لئے ازلبس ضروری ہے اور اگر اس نظامِ حیات کی کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہل جائے تو پوری انسانی زندگی میں اختلال و فساد کا رونما ہونا لازمی ہے۔

لَوِ اتَّبَعَ الحق اھوائھم لفسدت السمٰوات والارض ومن فیھنّ (مومنون) اگر حق (خدائی نظامِ حیات) ان کی خواہشات اور خود ساختہ رسم و رواج کا تابع ہو جائے تو ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے

انبیار و رسل کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے منتشر اجزار میں از سرِ نو ربط و نظم پیدا کریں

اور انسانوں کو افراط و تفریط کی راہوں سے ہٹا کر نقطۂ عدل پر کھڑا کر دیں۔

ولقد ارسلنا رُسلنا بالبیّنات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔	اور ہم نے رسولوں کو بین اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان (حدید) بھی

اُتاری تاکہ انسان نقطۂ عدل پر کھڑے ہوجائیں

بلکہ اسلام میں مقصود بالذات اس عالم رنگ و بو سے درار الورای چند مابعدالطبعیاتی حقائق ہیں جن کی تکمیل کے لئے عالم مادی محض واسطہ ہے۔ بالکل اس طرح کہ ایک معمار کو مکان کی تعمیر کے لئے چند مخصوص اوزار کی ضرورت ہے اور یہ اوزار اصل مقصد کے لئے محض ذریعہ ہیں اور خود مقصود بالذات نہیں، اب ظاہر ہے کہ مقصود بالعرض کو مقصود بالذات تصوّر کر لینے سے اجزاء حیات میں انتشار پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے اور اسلام اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا اسی بنار پر وہ اقوام عالم کے مادہ پرستانہ مناہج وطرق

کی نہایت شدت سے مخالفت کرتا ہے اور ان کی جدوجہدِ حیات کو ضلالت و گمراہی قرار دیتا ہے۔

هل ننبئكم بالاخسرين اعمالاً الذين ضل سعيهم فى الحيٰوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعًا۔ (کہف)	کیا ہم آپ کو ان لوگوں کی حقیقت بتائیں جو زندگی کی جدوجہد میں خسارہ اٹھا رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی سعی و کوشش صرف مادی ضروریات کی تکمیل میں گم ہو کر رہ گئی ہے اور پھر بھی وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ قرآنِ حکیم ان کے منافی فطرت عزائم کے ہلاکت انگیز نتائج سے ان کو متنبہ کرتا ہے

وکاین من قریۃ عتت عن امر ربها ورسله فحاسبناها حسابًا شديدًا وعذبناها عذابًا نكرًا۔ (طلاق)	کتنی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے پروردگار اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی پس ہم نے انکا سخت محاسبہ کیا اور انکو سخت عذاب میں ڈالا

وکذٰلک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ ان اخذہ الیم شدید۔ (ہود)	آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جبکہ وہ ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے اس کی پکڑ دردناک اور بہت سخت ہے۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھدینے کا نام ظلم ہے اور قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بات اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ اس نے اقوام عالم کی تباہی و بربادی کا سبب تنہا ظلم کو ہی قرار دیا ہے۔

وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون (نحل)	ہم نے ان قوموں پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتی رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی نگاہِ اوّلیں اس عالم رنگ و بُو کی رعنائیوں سے آگے نکل کر ایک دوسرے عالم جاودانی کا مشاہدہ کرتی ہے اور مردِ مومن کے لئے دنیادی لذّات وشہوات میں الجھنا اس کی حقیقی موت ہے۔ نسلیت، وطنیت، قومیت اور معاشی تقاضے اس کی راہ میں حائل

نہیں ہو سکتے بلکہ اس کی جد وجہد کا نقطۂ مرکز انسانیت کبریٰ
کا منتہائے کمال ہے۔

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہین دگر است
دگر است آنکہ بر د دانۂ افتادہ زخاک
آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
(اقبالؒ)

دنیا کی غلاظتوں اور جسم کی راحتوں کے لئے لڑنا دوسری
قوموں کا شعار ہے اور مسلمان اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی
دوسرے مقصد کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا بلکہ
وہ زخارف دنیوی اور جاہ و اقتدار کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا
بھی اپنی شانِ استغنا کے خلاف تصوّر کرتا ہے اور اس کا
"فقر غیور" دنیا کی ہر چیز سے اسے بے نیاز رکھتا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیوة الدنیا	ہم نے اہل کفر کو دنیاوی زیب و زینت کے جو مختلف النوع سامان

لنفتنهم فیه و رزق ربك خیر و ابقیٰ۔ (طٰہٰ)	دے رکھے ہیں اے نبی آپ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ ان چیزوں کے ذریعہ ہم ان کا امتحان

لینا چاہتے ہیں آپ کے لئے آپ کے پروردگار کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور پائدار ہے۔

مگر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے نظرِ حق شناس اور طبع ذوقِ آشنا کی ضرورت ہے یہ مادہ پرست قومیں اس بادۂ رنگیں کی سرمستیوں کا تصور بھی نہیں کرسکتیں ؎

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

اقوامِ حاضرہ کا جہادِ قومی اور جہد ملّی وطنیت کی چار دیواری میں محدود اور قوم و نسل کے علائق سے بندھا ہوا ہے یا ان کے پیٹ کی کمینہ خواہشات ان کو جنگ و قتال پر آمادہ کرتی ہیں بلکہ وطن، نسل، ثقافت، معاشی تقاضے اور اس قسم کے مادی اور عارضی تصوّرات ہی ان کی ہیئاتِ ترکیبیہ اور اجتماع و مدنیت کی تخلیق کرتے ہیں مگر مسلمان ان

چیزوں میں سے کسی کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں محسوس کرتا۔ اس کی قومیت کی بنار وطنیت و قومیت، نسل اور معشیت کا صنمِ باطل نہیں بلکہ نظریۂ توحید ورسالت ہے

از رسالت درجہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما ایمانِ ما
مسکنِ یار است شہرِ یار من
پیش عاشق ایں بود حب الوطن

(اقبالؒ)

اس بنار پر مسلمان کا جہاد ملّی بھی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ مادی ضرورتوں کا احساس اسے ہرگز جنگ وقتال پر آمادہ نہیں کرتا۔ اگر اسے اقتدارِ حکومت کی ضرورت ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے دینی مقاصد کو بروئے کار لاسکتا ہے ورنہ حصولِ اقتدار بھی اس کے نزدیک صنم باطل بن کر رہجاتا ہے۔

الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت

اہل ایمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور اہل کفر شیطان کی راہ میں۔

عن ابی موسی قال جاء رجل النبی صلعم فقال یارسول اللہ فان احدنا یقاتل غضبا ویقاتل حمیۃ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ (بخاری)

ایک شخص نے نبی کریم صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کچھ لوگ غضب وانتقام کے طور پر اور کچھ دوسرے قومی یا ملکی عصبیت کے لئے لڑتے ہیں تو آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ جو اعلاء کلمۃ الحق کے لئے لڑے گا صرف اسی کا جہاد جہاد فی سبیل اللہ متصور ہوگا۔

غرض وطن ہو یا قوم، نسل ہو یا قبیلہ، خودساختہ شعارِ قومی ہو یا داعیۂ معیشت و اقتصاد، ان میں سے ہر چیز اسلام میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اصل مقصد کے حصول کے لئے صرف آلہ کے طور پر کام آسکتی ہے

اگر اسے رکن اول کی جگہ دے دی جائے اور اصل مقصد کو پیچھے ڈھکیل دیا جائے تو اسلامی فلسفۂ اجتماع کی پوری عمارت متزلزل ہوکر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے نزدیک ہر وہ چیز صنم باطل کی حیثیت رکھتی ہے جو اُسے اصل مقصد سے ہٹا کر اپنی جانب پھیر لے (من شغلک من اللہ فہو صنمک)

مگر اس سلسلہ میں اقوام حاضرہ کے نقطہ ہائے نظر بالکل الگ ہیں، جو چیزیں ہماری نظر میں سب سے آخری جگہ پاتی ہیں وہ ان کی نظر میں سب سے اول مقام رکھتی ہیں بلکہ ان کی نگاہ میں ان حقیر مادی مقاصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں ان کے فلسفہ ہائے اجتماع میں اخلاقی اقدار کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جغرافی حدبندیاں قبیلوی اور نسلی عصبیت، خودساختہ طرز تمدن اور معاشی محرکات ان کی قومیتوں کے بنیادی پتھر ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا؟ کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو امن عالم کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی ہیں اور

موجودہ عالمگیر شورش واضطراب کا سرچشمہ ہیں۔ کیونکہ یہی وہ مادی تصورات ہیں جو عالمگیر اخوتِ انسانی کو ہزارہا متضاد اور متخالف گروہوں میں تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں، وطنیت کا اقتضاء یہ ہے کہ جغرافی حد بندیوں کے اعتبار سے سینکڑوں انسانی وحدتیں وجود میں آئیں، رنگ ونسل، رسم ورواج اور مخصوص تمدنی شعار بھی اسی طرح نوعِ انسانی کو کئی متضاد قومیتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور داعیات معشیت کا بھی یہی حال ہے کیونکہ ہر انسانی طبقے کا معاشی مفاد دوسروں سے نہ صرف الگ ہے بلکہ اکثر حالات میں متصادم ہوتا ہے غرض ان تمام تصورات کا ردِ عمل نفرت وغیرت، حقارت وتذلیل تسلط واستیلاء جلبِ دولت اور اقتصادی تفوق وبرتری کا حصول ہے اور چونکہ ہر ایسی قومیت میں یہ کینہ جذبات نہایت سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں اس لئے اس کا قدرتی نتیجہ انسانوں کے ان متخالف گروہوں میں باہم ہلاکت انگیز طبقاتی تصادم کی شکل میں رونما ہورہا ہے اور موجودہ شورش

و بدامنی کا پس منظر یہی کمینہ جذبات ہیں جو حریت ومساوات اور آزادی وطن کے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن کر نوع انسانی کی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں۔

گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد کئی امن کانفرنسیں ہوئیں، قیام امن کے لئے ہزاروں تجاویز زیر بحث لائی گئیں آئندہ جنگ کے خطرات کو روکنے کے لئے ہر قوم کے بڑے بڑے مدبر لگاتار کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں اور بظاہر ہر قوم دوسری قوموں کے خدشات کو دور کرنے کی انتہائی جدوجہد کر رہی ہے مگر اندر ہی اندر آئندہ جنگ کی تیاریوں میں بھی منہمک ہے کیا ان حالات میں قیام امن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر عقل ودانش کا تقاضا یہی ہے کہ یہ لوگ امن کی کانفرنسیں اور تحدید اسلحہ کی بے سود کوششیں چھوڑ کر اس عالمگیر شورش و اضطراب کے اصل سرچشمہ کی ٹوہ لگائیں اور عوارض مرض سے اپنی توجہ ہٹا کر اصل سببِ مرض کی تشخیص میں مصروف سعی ہوجائیں

یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اصل جراثیم بدستور پرورش پاتے رہیں اور مرض کا خاتمہ بھی ہوجائے یا ان جراثیم کی بیخ کنی کرنے اور مریض کو ان کی ہلاکت خیزیوں سے بچانے کے بجائے افیون کے انجکشنوں سے اسے بے ہوش کردیں اور پھر دنیا پر یہ ظاہر کرنا شروع کردیں کہ مریض اب رو بصحت ہے اگر آپ اس مرض کا بالکلیہ ازالہ چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو اجتماع وتمدن کے ان فاسد نظریوں کو تبدیل کرنا ہوگا اور اسلام کے صالح نظام اجتماع میں پناہ لینی ہوگی۔

اسلام ایک ایسے طرز اجتماع وتمدن کا بانی ہے جس کی عمارت پائدار، مضبوط اور مستقل بنیادوں پر قائم ہے یعنی اسلامی نظام اجتماع جن تصورات پر مبنی ہے وہ ایسے ازلی اور ابدی حقائق ہیں کہ رنگ ونسل کے ناپائدار علائق، وطنیت کی مصنوعی حدبندیاں اور معاشی تقاضے ان پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ اور نہ ہی زمانہ کے انقلاب وتغیر کو ان میں کوئی دخل ہوسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس یہ الہیاتی نظریے حیات انسانی کے ہر شعبہ

پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پوری زندگی کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

زمانۂ حاضر کے نظریۂ ہائے اجتماع صرف مادی ضرورتوں کی پیداوار ہیں اور ان کا وجود و لبقاء ان مادی احساسات کا تابع ہے اس لئے ان کو کوئی پائدار اور مستقل حیثیت حاصل نہیں بلکہ احوال و ظروف کے پیمانہ کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان مادی احساسات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم بھی ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فلسفہ ہائے اجتماع کا کوئی معین دائرہ عمل نہیں جو ان کے طرزِ اجتماع میں ربط و تسلسل پیدا کردے۔

نیز یہ وطنی، نسلی، ثقافتی اور اقتصادی قومیتیں اپنے جداگانہ تشخصات کی وجہ سے من کل الوجوہ باہم متغائر ہیں اور کوئی امران میں وجہِ اشتراک نہیں، ہر قومیت اپنے علیحدہ تشخص کو جو اُسے ایک محدود خطۂ ارضی میں بسنے یا لسانی اور معاشرتی خصوصیات یا رنگ و نسل کے علائق یا معاشی

مقتضیات کی وجہ سے حاصل ہے کہ تحفظ و بقار کو ہی زندگی
کا آخری نصب العین تصور کرتی ہے اور ہر ایسی جد وجہد
کو وہ اپنے لئے ذریعہ نجات تصور کرتی ہے جو ان نا پائدار
احساسات کو اُبھار نے اور ان عارضی قومیتوں کی برتری کے
لئے عمل میں لائی جائے چنانچہ دورِ حاضر کی تمام قومیتوں کا
یہی حال ہے ایسی حالت میں کوئی ہمہ گیر صداقت (یونیورسل
ٹروتھ) ان کے مدنظر نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ قومیتیں ان
عالمگیر صداقتوں اور انسانیت مطلقہ کے مقتضیات کی جانب
توجہ دے سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کے فلسفہ ہائے اجتماع کی بنیاد
ہی چند ایسے مادی نظریات پر قائم ہے جو کسی طرح نوعِ
انسانی کے تمام افراد میں وجہِ اشتراک نہیں بن سکتے۔ بلکہ
اس کے برعکس ان میں ہر طرح کا تضاد پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ آج ہر قوم اپنے سیاسی اور اقتصادی تفوق کے حصول
میں سرگرم نظر آتی ہے اور روحانی تصورات یا اخلاقی اقدار
کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اسلامی فلسفۂ حیات کی پوری عمارت چونکہ الہیاتی تصورات اور اخلاقی اقتدار پر قائم ہے اس لئے اس کے ہر جزو میں ایک ہی روح کارفرما ہے اور وہ ایک ہی چیز اسلام کے نظام تمدن و تہذیب کا نقطۂ مرکز ہے اور اس الہیاتی نظام کے تمام اجزار اسی مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم اعمالکم۔	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو اس سے تمہارے اعمالِ زندگی میں اصلاح و نظم پیدا ہوگا

اس "تقویٰ" کا اوّلین ردعمل اسلامی ضابطۂ اخلاق کی پابندی اور انسانی اعمال کی اصلاح و تنظیم کی شکل میں رونما ہوتا ہے اور اسی سے عملی جدوجہد کی راہیں نکلتی ہیں۔

اقوام حاضرہ کا نظامِ فکر اور دستور اخلاق خارجی حالات اور کائناتی تبدیلیوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے، معاشرہ اور طرزِ اجتماع کی انقلابی حالتوں کے ساتھ ساتھ ان کا فکر و ذہن

بھی بدلتا چلا جاتا ہے۔ موجودہ مفکرین نے اس نظریہ کو مستند تسلیم کیا ہے کہ دماغ ایک آلۂ خیال ہے اور اس کی ہر داخلی کیفیت خارجی اثرات کا نتیجہ ہے گویا ان کے نزدیک ذہنی اور فکری ارتقار کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی اندرونی قوتیں بیرونی احوال ونتائج کی پابند وتابع ہوجائیں۔ چنانچہ ماہر حیاتیات ہربرٹ سپنسر نے اخلاقیات کی تعریف یہ کی ہے کہ ہر وہ کام اخلاقی ہے جو انسان کی داخلی کیفیات کو خارجی احوال وظروف پر منطبق کرنے میں مدد دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانوں کے خارجی حالات اگر عالم انسانی کو تباہی و بربادی کیطرف لے جارہے ہوں تو فکروذہن کی قوتیں بھی ان حالات کے ساتھ مل کر تباہی کو قریب تر لانے میں مدد دیں تاکہ دماغ کی اس اطاعت شعاری کو اخلاقیات کے دائرہ میں موزوں جگہ مل سکے۔ کبرت کلمۃً تخرج من افواھھم ان یقولون الّا کذباً

اسلام کا نقطۂ نظر اس بارے میں اس کے بالکل برعکس ہے یعنی اسلام کے مابعد الطبعیاتی نظریات ایک مخصوص طرزِ تمدن

اور دستور اخلاق کی تخلیق کرتے ہیں اور ان نظریات کی ارتقائی حرکت کے ساتھ ساتھ اجتماع و تمدن اور اخلاق کے دو اثر بھی بدلتے جاتے ہیں اور نظامِ تمدن اور دستور اخلاق کا حسن و قبح اور صلاح و فساد داخلی کیفیات کا ردِ عمل (ری ایکشن) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ایمان کو ہر جگہ عمل صالح سے مقدم رکھا ہے اور ایمان باللہ کو پورے نظام فکر و عمل کے لئے مرکز و محور قرار دیا ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینّہ حیوۃً طیّبۃً (آیہ)	مرد ہو یا عورت جو بھی نیک کام کرے گا بشرطیکہ وہ مومن ہے ہم اس کی زندگی کو نفیس اور پاکیزہ کردینگے

اور احادیث نبوی سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے

عن سفیان بن عبد اللہ الثقفی رح قال قلت یارسول اللہ قل لی فی الاسلام شیئاً لا اسئل عنہ احداً بعدك قال قل اٰمنت باللہ	سفیان ابن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپ اسلام میں کوئی ایسی بات بتادیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی دوسرے

ثمّ استقم	سے پوچھنا نہ پڑے۔ فرمایا! آمنتُ
(راوہ مسلم)	باللہ کہو اور اس پر ڈٹ جاؤ۔

غرض اسلام میں سماج (اجتماع) کے تمام شعبے خواہ وہ خارجی ہوں مثلاً سیاست، معشیت اور معاشرت جن کا عام نام "تمدن" ہے یا داخلی ہوں جیسے نظامِ تعلیم، دستورِ اخلاق، ادب و آرٹ جو تہذیب کے دائرہ میں آتے ہیں۔سب الٰہیاتی تصورات یعنی ایمان باللہ کے تابع ہیں۔

امارت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

ان تصریحات کے بعد ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عہدِ حاضر کا کوئی سماجی نظریہ اسلام کے نظریۂ اجتماع سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسلامی فلسفۂ حیات کے تمام اجزاء مثلاً نظریۂ سیاست و معشیت، دستور اخلاق و معاشرت، نظام تعلیم، جماعتی آئین تنظیم ملی اور جہاد حریت اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بالکل جداگانہ اور مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہیں۔اور یہ مکمل فلسفۂ

حیات کسی دوسرے نظریۂ زندگی سے کسی سمجھوتہ کا روادار نہیں، نہ اپنے اندر کسی نظریہ کو جذب کرنا چاہتا ہے نہ خود اس میں جذب ہونا پسند کرتا ہے اور نہ ہی اس کے زیر اثر رہنا گوارا کرتا ہے بلکہ وہ ایک جامع اور مستقل بالذات نظامِ تمدن و تہذیب کا بانی ہے۔

عصرِ حاضر کے عناصرِ قومیّت

ان ضروری مباحث کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ ہم دورِ حاضر کے عناصرِ قومیت اور داعیات اجتماع پر کتاب و سنت کی روشنی میں تبصرہ کریں اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کا بھی تجزیہ کریں جن کی وجہ سے عالمِ انسانی کو ہولناک مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کے جراثیمی تعدیہ نے کس طرح عالم اسلامی کی وحدتِ ملی اور مرکزیت کو پارہ پارہ کیا ہے؟ یہ ایک دلخراش داستانِ الم ہے جو دردناک ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔

حدیث درد دل آویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چو دراز تر گردد

وطنیت

یوں تو اپنے آبائی وطن سے محبت و شیفتگی انسان کا

ایک فطری اور طبعیٔ اقتضاء ہے اور وطنیت کا جذبہ درحقیقت
کوئی نئی چیز نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہونے کی
حیثیت سے ہمیشہ انسان کا ساتھ دیتا رہا ہے اور اس سے
انکار کرنا درحقیقت عملی نفسیات (پریکٹیکل سائکالوجی) کے بین
حقائق سے انکار ہے مگر اس سے بھی زیادہ جو بات ناقابلِ انکار
ہے وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی سے پہلے وطنیت کو یہ اصطلاحی
حیثیت حاصل نہ تھی. اور نہ ہی تاریخ کے کسی دور میں اُسے
اتنی اہمیت حاصل کی ہے جو اس وقت اسے حاصل ہے
اور دراصل نفسِ جذبہ وطنیت اتنی بُری چیز نہیں مگر کوئی انسانی
داعیۂ فطرت جب حد اعتدال سے بڑھ جائے یہاں تک کہ
دیگر مقتضیات انسانیت اس کی رو میں بہہ نکلیں تو اس کا
قدرتی نتیجہ عالمِ انسانی کے فساد و اختلال کی شکل میں رونما
ہوتا ہے کیونکہ نظامِ عالم کا بقار وقیام صرف اسی صورت میں
ممکن ہے کہ تمام اجزار حیات کو اپنی اپنی جگہ کام کرنے کا
موقعہ ملتا رہے اور ان میں فطری تناسب اور توازن قائم

رہے، اور اگر حیات انسانی کا کوئی ایک جزو اُبھر کر اتنا اونچا چلا جائے کہ دیگر اجزارِ حیات اس کے نیچے دب کر رہ جائیں تو پورے نظام زندگی میں تعطل کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور عالم انسانی کو ہر قسم کے مہالک دخطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں مشرق دمغرب کی اقوام احبابِ وطنیت کو اتنی اونچی سطح پر لے گئی ہیں کہ زندگی کے تمام لوازم ومقتضیات سے توجہ ہٹا کر صرف اسی کو نبار قومیت مان لیا گیا ہے گویا حیاتیات کا دسیع دائرہ صرف اسی نقطہ مرکز کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور اسی بنار پر آج ہر جغرافی واحدہ (یونٹ) اپنے آپ کو اسی قسم کے دوسرے واحدوں سے اعلیٰ دبرتر تصور کرتا ہے اور اپنی سیاسی و اقتصادی عظمت وبرتری کے حصول میں کروڑہا انسانی لاشوں کو پاؤں تلے روندتا چلا جارہا ہے۔ یہی وہ مکروہ جذبہ ہے جس نے طاقتور اقوام کو کمزور اقوام پر مسلط کر رکھا ہے اور حریت ومساوات کے بلند بانگ دعاوی کے علی الرغم انسانوں کے مقدّس خون سے

ہولی کھیلی جارہی ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
مقصود ہے تسخیر تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(اقبالؒ)

حقیقت یہ ہے کہ وطنیت کی اس ہمہ گیر دبار کی ہلاکت خیزیوں نے کائنات انسانی کو جہنم بنادیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس خود غرضانہ جذبۂ وطنیت نے انسانیت کے عالمگیر رشتۂ اخوت کو تار تار کردیا ہے اور عالم انسانی کو سینکڑوں ایسے متضاد و متخالف گروہوں میں تقسیم کردیا ہے جن کے مادی اغراض میں کبھی یکسانیت پیدا نہیں ہوسکتی اور آج ہر وطنی قومیت کے عزائم یہ ہیں کہ وہ تمام کرۂ ارضی کی

سیاست وتجارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر نوعِ انسانی کو ابدالآباد کے لئے محکوم بنائے رکھے چنانچہ گذشتہ عالمگیر جنگ کی ہلاکت آفرینیاں اسی منحوس جذبہ کی پیدا کردہ ہیں اور جب تک اقوام عالم کے نظریۂ قومیت و اجتماع میں بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی اس وقت تک یہ دنیا وحشت و بربریت کے خونچکاں مناظر دیکھتی رہے گی اور امنِ عالم کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیگا

ان تنج منہا تنج من ذی عظیمۃ
الا فانی لا اخالک ناجیا"

عالمِ اسلامی اور تصوّرِ وطنیت

یہ کون نہیں جانتا کہ اسلامی قومیت کی بنیاد نظریۂ توحید ورسالت پر ہے اور اسلام کا پورا نظامِ اجتماع و سیاست اسی اصل پر مبنی ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی کونے میں رہتا ہو افریقہ کا وحشی ہو یا پیرس اور لندن کا مہذب شہری، کالا ہو یا گورا عربی ہو یا عجمی ہر حال میں وہ اس عالمگیر اسلامی قومیت

(انٹرنیشنلزم) کا مغز رکن ہے اور دنیا کا کوئی رشتہ اسے اس قومیت سے جدا نہیں کرسکتا۔ مگر عالم اسلامی کے لئے وہ منحوس ترین دور تھا جب کہ مغربی اقوام نے اپنی پیہم ریشہ دوانیوں سے ممالک اسلامی کے جسد ملی میں وطن پرستی کے زہر ہلاہل کے انجکشن شروع کردیئے اور دنیائے اسلام کی ہمہ گیر اخوتِ اسلامی کو پارہ پارہ کرکے رکھدیا۔ یہ ایسا خطرناک زہر تھا کہ اس کی تلخی نے آج تک ان کے کام و دہن کو مسموم کررکھا ہے اور انھیں خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ اور اب وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاطر فرنگ نے مرکزیت اسلامی کو فنا کرنے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا تھا اور اسی مقصد کے لئے وہ تہذیبِ نو کا چراغ ہاتھ میں لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرا۔

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے

ہر ملّتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے

بجلی کے چراغوں سے منوّر کئے افکار

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ میرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار
(اقبالؒ)

شاطرانِ یورپ نے عربی ممالک میں وطنیت کے جذبہ کو ابھار کر ان کو ٹرکی کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا اور انھیں یہ فریب دیا کہ ان کے لئے ایک خالص عرب نیشنل اسٹیٹ قائم کی جائے گی جس کی حدود میں فلسطین اور شام بھی شامل ہوں گے چنانچہ شریف مکّہ سر میکموہن کے درمیان جو معاہدہ طے ہوا تھا اس میں عربوں کے لئے آزاد اسلامی جمہوریت کے قیام کا واضح الفاظ میں وعدہ کیا گیا نیز فلسطین اور شام کے کچھ حصّے بھی اس موعودہ عربی ریاست میں شامل کرنے کا لالچ دیا گیا مگر جنگ کے خاتمہ پر ان مواعید کی جو مٹی پلید کی گئی اس نے عربوں کی آنکھیں کھولدیں۔ عربی ممالک کے

حصے بخرے کر لئے گئے، فلسطین انگریز کے ہاتھ آیا اور شام فرانس کے انقلاب میں چلا گیا۔ اور سرمیکموہن نے اس کے بعد "لندن ٹائمس" میں ایک بیان شائع کر دیا جس میں یہ کہا گیا کہ فلسطین جزیرۂ عرب میں داخل نہ تھا مگر امیر عبداللہ والی شرق اردن نے اس دستاویز کی نقل وزیر مستعمرات اور میکموہن کے پاس بھیج دی جس میں موعودہ عرب جمہوریت میں فلسطین کو بھی داخل تسلیم کیا گیا تھا۔

مصر میں بھی اسی وطنیت کا بیج بویا گیا اور بالآخر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ اہل مصر لگاتار جدوجہد کے باوجود آج تک انگریزی انتداب سے پیچھا نہیں چھڑا سکے، آج ایک بہت بڑے عرصہ کے بعد اسلامیانِ عالم کو ہوش آئی ہے اور اب وہ پھر ایک دفعہ اتحادِ اسلامی (پان اسلامزم) کے لئے بے قرار نظر آرہے ہیں اور "عرب لیگ" کی شکل میں انھوں نے عربی ممالک کا ایک بلاک بھی قائم کر دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اتحادِ اسلامی کی اس تحریک میں مصر ہی سب سے زیادہ دلچسپی لے

رہا ہے

یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

بہر حال انگریز کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ عالم کی عالمگیر وحدتِ ملّی کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ وطنی قومیت (نیشلز) کا زہر ان کے جسم میں داخل کر دیا جائے تاکہ عالم اسلامی مختلف وطنی وحدتوں (یونیٹز) میں تقسیم ہو کر بین الاسلامی مرکزیت کو اپنے ہاتھوں دفن کر دے اور اس مقصد میں اسے ایک بڑی حد تک کامیابی ہوئی ۔

انگریز نے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے استقلالِ ملّی کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی یہاں ان کے جداگانہ تشخص کو فنا کرنے اور ان کو متحدہ قومیت میں جذب کرنے کی ایک زبردست مہم چلائی اور اس کی پہلی کڑی یہ تھی کہ مسلمان کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج بنا دیا گیا۔ اپنے حاکمانہ اقتدار کو ایسے ڈھنگ پر استعمال کیا کہ ہندو کو ابھار کر اونچی سطح پر لا کھڑا کیا اور مسلمان کے قومی و ملّی جذبات کو کچل کر

رکھدیا گیا چنانچہ ایک انگریز (ہنٹر) نے اپنی قوم کے اس ظالمانہ کردار کو اپنے مخصوص منافقانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے :۔

ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے پچھتّر سالوں میں انتظامِ ملک کی خاطر اسی طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران میں ہم نے اپنا طریقہ بھی رائج کرنا شروع کردیا تھا پھر جوں ہی ایک نسل اس نئے طریقے کے ماتحت پیدا ہوگئی ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیرباد کہدی جس سے مسلمانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہوگیا اگر مسلمان ذرا بھی عقلمند ہوتے تو اس تبدیلی کو بھانپ جاتے اور اپنی قسمت پر قناعت کرتے مگر ایک پرانی فاتح قوم اپنے شاندار ماضی کی روایات کو جلد فراموش نہیں کرسکتی۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

یہ طریقۂ تعلیم کیا تھا؟ اس کے لئے لارڈ میکالے کے وہ تاریخی الفاظ کافی ہوں گے کہ

"ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دلانا اس لئے ضروری ہے
کہ اس سے آہستہ آہستہ ہندوستانی ایک ایسی قوم میں
تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی
اور کلچر کے اعتبار سے انگریز ہو گی۔"

انگریز کی یہ تعلیمی حکمت عملی اثر و نتیجہ کے اعتبار سے مسلمانوں
کے مخصوص طرز اجتماع اور طریق تمدن کے لئے سخت تباہ کن
تھی اور ہندو کے لئے یہ سوال کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ اس کے
پاس کوئی اپنا نظام تمدن اور ضابطۂ اخلاق نہ تھا اور اس کی
قومی روایات ہی یہ ہیں کہ وہ ہر طاقتور کے سامنے گھٹنے ٹیک
دیتا ہے اور ہر نئے رنگ کو قبول کرنا اس کی فطرت میں داخل
ہے۔ نیز انگریز بھی جانتا تھا کہ ایک بنیا قوم کے لئے سب سے
زیادہ دلکش چیز یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو معاشی ضرورتوں کی
تکمیل کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور اس طرح
ہندو قوم کا مکمل تعاون حاصل کیا جائے مگر مسلمانوں کی
حالت اس سے بالکل جداگانہ تھی، ان کے پاس ایک مکمل

ضابطۂ اخلاق اور نظامِ اجتماع و تمدن تھا اس لئے ان کے لئے
یہ امر سب سے زیادہ دشوار تھا کہ وہ اپنے قومی تشخص کو فنا کرکے
کسی ایسی قومیت میں جذب ہوجائیں۔ نیز زوالِ حکومت کے بعد
مسلمانوں کو جن شدائد و مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس کا
لازمی نتیجہ ان کے فکر و ذہن میں انتشار کی شکل میں ظاہر ہوا
اور اس بنا پر وہ اپنے لئے کوئی صحیح لائحہ عمل بھی متعین نہیں
کر سکتے تھے کیونکہ یہ خوفناک منظر ان کی آنکھوں نے پہلے کبھی
نہ دیکھا تھا۔ غرض مسلمانوں کی جداگانہ اور مستقل قومیت
پر یہ پہلا وار تھا۔

نیز انڈین نیشنل کانگریس کا قیام بھی اس سلسلہ کی ایک
کڑی ہے پہلے پہل انگریزوں نے ہی یہ جماعت قائم کی تھی
اور درحقیقت مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو مٹا کر ایک
متحدہ ہندوستانی قوم کی تعمیر کے لئے یہ دوسرا قدم تھا۔ چنانچہ
کانگرس آج بھی اسی راستہ پر گامزن ہے اور مسلمان
بھی ایک عرصہ تک اس گمراہی میں مبتلا رہا۔ مگر آج استقلال

ملّی کے احساس نے اِسے کانگریس کے مدمقابل کھڑا کر دیا ہے۔

غرض انگریز نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کے استقلال قومی کے مقابلہ میں زبردست مہم شروع کردی اور اس میں اُسے ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی چنانچہ کمپنی بہادر کے عہد میں سب سے پہلے بہار کے ایک طباطبائی سید نے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی اس میں اکبر کی "ہندی قومیت" کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

مذہب الٰہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دراں بود تا عہد جہانگیری رواج داشت باز از عہد شاہجہاں تعصب شروع شدہ در عہد عالمگیر شدت پذیرفت۔

(سیر المتاخرین صـ۱۴۱ ج-۱)

یعنی دین الٰہی جس میں مخلوق کے لئے بیشمار آسائشیں تھیں صرف عہد جہانگیری تک رواج پاسکا اور شاہ جہاں کے عہد سے پھر تعصب شروع ہوگیا اور پھر عالمگیر کے عہد میں اس نے اور بھی شدت اختیار کرلی۔

بہار کا علاقہ بنگال کی طرح کمپنی بہادر کے زیرنگیں تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز نے آتے ہی اپنی سیاست کی بنیاد متحدہ قومیت اور مذہبیت پر رکھی تھی۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قومیت کی اس پہلی کوشش کا بھی مختصراً ذکر کردیا جائے جو انگریز کی آمد سے کافی عرصہ پہلے عمل میں لائی گئی تھی۔

قومیت متحدہ کی پہلی کوشش

اس سے پہلے کسی باب میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کے اجتماعی تصوّرات میں اگرچہ بنی اُمیہ کے دور سے ہی تبدیلی شروع ہوگئی تھی مگر کم ازکم یہ امر عالم اسلامی میں اب تک مسلم چلا آتا ہے کہ اسلامی قومیت کی اساس اسلام کے مخصوص نظریات پر ہے مگر اکبر کے عہد میں یہ کسر بھی پوری ہوگئی اور اس نے ایک جدید ہندی قومیت کی بنیاد رکھی جس میں ہندو سماج کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی۔یہی وجہ

ہے کہ آج ہندو اکبر کو "اکبر دی گریٹ" کے معزز خطاب سے یاد کرتا ہے اور اس کے نئے دین کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے اور ایک رسوائے عالم کانگریسی مسلمان نے یہاں تک کہہ دیا کہ "یہ ان لوگوں (اکبر وغیرہ) کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں۔"

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں جب بھی کوئی نیا فتنہ اٹھا تو سب سے پہلے علماء سوء نے اس کا ساتھ دیا اور امراء وسلاطین نے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ اسی گروہ کو آلۂ کار بنایا چنانچہ اس دور میں یہی چیز سامنے آتی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں رقمطراز ہیں:-

دراں سال اسافل واراذل عالم نمائے جاہل تعاضد دلائل باطل نمودہ بریں آوردند کہ حالا صاحب زمانے کہ رافع خلاف و اختلاف ہفتاد	اس سال کچھ کمینہ اور رذیل عالم نما جاہلوں نے دلائل باطلہ سے یہ بات ثابت کی ہے کہ وہ "صاحب زمان" جو ہندو اور مسلمانوں کے

دو ملت از مسلم و ہندو باشد حضرت اند	بہتر ۷۲ فرقوں کے اختلاف کو دور کرنے والا ہو گا وہ حضرت (شاہِ اکبر) ہی ہیں۔
منتخب التواریخ صہ ۲۷۹	

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :-

عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلماتِ بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و بہ احیاءِ سنت لب کشاید، اکثر علماء ایں وقت رواج دہند ہائے بدعت اند۔	عالم بدعت کے دریا میں غرق ہو چکا ہے اور بدعت کی تاریکیوں میں آرام کر رہا ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ بدعت کے خلاف آواز اٹھائے اور احیاء سنت کے لئے زبان کھولے اس وقت کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے ہیں ۔
مکتوبات صہ ۱۴۵ دفتر دوم حصہ ہفتم۔	

اس ہندی قومیت کے علمبرداروں نے احکام اسلامی اور شریعت حقہ کی علانیہ توہین شروع کر دی شراب حلال کر دی گئی ۔ سود اور جوئے کی عام اجازت دے دی گئی ۔ خنزیر اور کتے کی حرمت کو منسوخ کر دیا گیا اور ختنہ کی رسم اڑا دی گئی

غرض شریعت مصطفوی کو رسوا کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ عربی زبان کا سیکھنا اور علوم عربی کی تحصیل عیب شمار ہوتی تھی۔

عربی خواندن و دانستن آں عیب شد و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانده آں مطعون و مردود شد (منتخب التواریخ)	عربی پڑھنا اور جاننا عیب خیال کیا جاتا ہے فقہ، تفسیر، حدیث اور ان علوم کا جاننے والا مطعون اور مردود ہوگیا ہے۔

ملا صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

بدبختے چند از ہندواں و مسلمانان ہندو مزاج قدح صریح بر نبوت می کردند۔	چند ہندو اور ہندو مزاج مسلمانوں نے نبوت پر سخت حملہ کیا ہے۔

ہندی قومیت کے علمبردار اکبر نے یہ احکام صادر کردیئے تھے کہ ہندؤں کی کتابوں کو ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرکے مسلمانوں میں ان کو رواج دیا جائے۔

چنانچہ ملا عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں :-

اکنوں کتابہائے ہندی را کہ دانایانِ مرتاض عابد نوشتہ اند وہمہ صحیح و نص قاطع است ومدار دین و اعتقادیات وعبادات ایں طائفہ (ہندو) برآنست ترجمہ از ہندی بزبان فارسی فرمودہ چرا بنامِ خود نہ سازم کہ غیر مکرر وتازہ است و ہمہ مثمر سعادت دینی و دنیوی

ص ۳۳۰

اب ہندی کی کتابوں کو جو ہندوں کے زہد پیشہ علماء وعقلاء نے لکھی ہیں اور سب صحیح اور نص قاطع ہیں زود ہندو کے اعتقادات، عبادات اور دین کا ان پر ہی دارو مدار ہے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کر کے کیوں نہ اپنے نام سے تصنیف کر دوں جو غیر مکرر اور تازہ مضمون پر مشتمل ہیں اور سب دنیوی و دینی سعادت پر منتج ہیں۔

اکبر کے بعد عہد جہانگیری کا بھی یہی حال رہا۔ چنانچہ حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

غربتِ اسلام نزدیک بہ یک قرن بہ نہجے قرار یافتہ است کہ اہل کفر بہ مجرد اجرائے احکام کفر بہ برملا در

ایک زمانہ سے اسلام کی غربت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اہل کفر علانیہ احکامِ کفر کے اجراء و نفاذ پر

بلاد اسلامی راضی نمی شوند۔ می خواہند که احکام اسلامی بالکلیہ زائل گردند و اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نه شود کار باں سرحد رسانیده اند که رگِ مسلمانے از شعائر اسلام اظہار نماید به قتل می رسد۔

(مکتوبات ص ۱۰۶)

مطمئن نہیں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ احکام اسلامی بالکلیہ فنا ہوجائیں مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان اسلامی شعائر کا اظہار کرتا ہے تو اُسے قتل کردیا جاتا ہے۔

یہ تھی ملت اسلامیہ کے استقلال کو ختم کرنے کی پہلی کوشش جس نے مسلمانان ہند کے عقائد و اعمال میں تزلزل پیدا کردیا تھا اور مجدد ملت حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملحدانہ تصور قومیت کو اپنی روحانی قوت سے شکست دیکر ہمیشہ کے لئے اسکا خاتمہ کردیا۔ یہ سچ ہے کہ اگر خدائے بزرگ و برتر اس وقت حضرت مجدد سے اپنے دین کی خدمت نہ لیتا تو آج ہندوستان میں شاید ایک مسلمان بھی نظر نہ آتا۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے گرمیٔ احرار

قومیّت کے دیگر عناصر

رنگ و نسل، مخصوص طرز تمدن، ثقافت اور معاشی محرکات بھی قومیت کے عناصر شمار ہوتے ہیں۔ جہاں تک رنگ و نسل کا تعلق ہے بے شک یہ ایک قدرتی رشتہ ہے جو چند افراد انسانی میں باہم محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور ان افراد کے رہن سہن اور باہمی تعلقات سے ایک مخصوص طرز معاشرت، زبان، ثقافت اور تہذیب کی تخلیق ہوتی ہے۔ مگر ان امور کا پس منظر صرف مادی تقاضے ہیں جو ان کو اپنے مادی وجود کے بقار و تحفظ پر آمادہ کرتے ہیں مگر انسانیت کے اس اہم ترین شعبہ کو جو اخلاقی اقدار اور روحانیات سے

موسوم ہے، اور تنہا سعادت و فلاح انسانی کا ضامن ہے ان امور میں کوئی دخل نہیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ نظامِ تمدّن صداقت دیانت اور تمام ایسی صفات سے یکسر عاری ہے۔

نیز متذکرہ بالا داعیاتِ قومیت، انسانیت کے اس ابتدائی دور کی غمازی کرتے ہیں۔ جبکہ عالم اسلامی سن طفولیت سے گزر رہا تھا اور اس کے نظریۂ اجتماع نے ایک کنبہ کی چاردیواری سے آگے نکل کر قبیلہ و خاندان کی محدود وسعت میں قدم رکھا تھا۔ مگر عالم انسانی کا منتہائے مقصود وہ عالمگیر رشتۂ اخوت ہے جو ان عارضی قیود سے بالکل آزاد اور ہمہ گیر صداقت کا تابع ہے

نیز قومیت کے یہ عناصر محض عارضی اور ناپائدار ہیں، جب ایک شخص اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں مستقل رہائش اختیار کرلیتا ہے تو دفعۃً یا تدریجاً اس کے معاشی تقاضے، طرز معاشرت، ثقافت اور زبان وغیرہ سب بدلجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ایسے رشتہ کو قومیت کی اساس نہیں قرار دیتا جو احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ بدل

جاتا ہے بلکہ اسلام میں قومیت کی اساس وہ عقائدِ راسخہ ہیں جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہیں اور کوئی خارجی اثر ان میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا۔

اسلام کا نظریۂ قومیّت

انسانیت کبریٰ کے ارتقار کی آخری منزل فکر و عمل کا وہ بلندترین مقام ہے جو اسلامی نظریۂ حیات کے توسط سے حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی وہ آخری دور مکمل فلسفۂ زندگی ہے جو انسانوں کے غیرفطری اور تباہ کن احساساتِ قومیت کے علی الرغم ایک عالمگیر اخوتِ انسانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور کائناتِ انسانی کو ایسی پُرامن دنیا میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جہاں جنگ و قتال کے یہ خونین مناظر ہوں نہ شیطانی آلاتِ حرب کی تباہ کاریاں! ظالم کے طاقتور بازو میں اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ وہ انسانی آبادیوں کو تہ وبالا کر کے اس کے وسائل معیشت پر غاصبانہ تسلط قائم کرسکے مظلوم انسان کی دردناک آہیں دنیا کے کسی گمنام گوشہ سے بھی سنی نہ جاسکیں اور یہ چیخ و پکار کی یہ دلخراش صدائیں جو آج دنیا کے گوشے گوشے سے بلند

ہو رہی ہیں کیف انگیز نغموں میں تبدیل ہو جائیں اور یہ دنیا جنّت کا نمونہ بن جائے۔ تلک الجنة التی اورثتموها بما کنتم تعملون کی صداؤں سے فضائے آسمانی گونج اٹھے۔

یہ مبارک ساعت کب آئے گی؟ اس وقت جب کہ عقل انسانی ہر طرف سے عاجز آکر اپنی شکست کا اعتراف کرے گی اور بالآخر اُسے انبیاء و رسل کے لائے ہوئے نظریۂ حیات کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ انسانی فکر و ذہن میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو جائے گی اور اقتدارِ حکومت ان جفا پیشہ اقوام کے ہاتھوں سے نکل کر خدا پرست اور صالح انسانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰة وٰاتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ( ) وہ لوگ جن کو ہم اگر غلبہ اور تمکنت فی ارض عطا کریں گے تو وہ نماز کو قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ تصادم اقوام کے نتائج ایک دفعہ پھر عالم انسانی کو نکر د عمل کے اُس مرکز کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس سے اس کی کائناتی حرکت کی ابتداء ہوئی تھی اور قیام قیامت سے پہلے یہ حرکتِ زمانی اس آخری منزل تک پہنچ کر رہے گی جیسے آج سے تیرہ سو سال پہلے زمانۂ رسالت صلعم میں بھی دنیا تمام حرکت کا ایک نظارہ دیکھ چکی ہے۔

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض۔ (بخاری)

زمانہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اسی مرکز طبعی پر آپہنچا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا تھا۔

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم (اقبال)

اصطلاحی قومیت

قوم دراصل عربی لفظ ہے جس کا مادہ ایسی کثرت پر دلالت

کرتا ہے جس میں وحدت و اجتماع کی حالت موجود ہو، قوام
تقویم اور اس قسم کے دوسرے الفاظ جو اس مادہ پر مشتمل
ہیں سب میں من وجہ یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ عربی زبان میں
فرقہ اور افراد کے نہایت مختصر مجموعہ پر بھی قوم کا اطلاق ہوتا
ہے۔ مگر اسی وقت جبکہ ان میں کوئی وجہِ جامعیت موجود ہو۔

قوم لہم فکرۃٌ تجول بہم
بین المعانی اولئک النُّجبُ

وحدتِ نسل پر قوم کا اطلاق تمام زبانوں میں پایا جاتا
ہے اور متعارف بین الناس ہے قرآن قریم میں جہاں
انبیاء علیہم اسلام کافر اقوام کو "یا قومِ" سے خطاب کرتے
ہیں وہاں اتحادِ نسل کے سوا کوئی وجہِ جامعیت نہیں یہی وجہ
ہے کہ قومِ موسیٰ اور قوم فرعون ہر جگہ دو الگ الگ قومیں
ذکر ہوتی ہیں حالانکہ اتحاد مکانی کی بناء پر ایک قوم کا اطلاق
ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح یہودِ مدینہ اور مسلمانوں کو الگ
الگ قوم قرار دیا گیا ہے حالانکہ اتحاد مکانی یہاں بھی موجود

ہے یاایھا الذین آمنوا لاتتولوا قوماً غضب اللہ علیھم۔

اس مختصر مقالہ میں لغوی مباحث میں الجھنا کچھ مفید مطلب نہیں ہوگا کیونکہ ہمارا موضوعِ بحث لغوی قومیت نہیں بلکہ اصطلاحی قومیت ہے۔

الفاظ جب اپنے لغوی معانی سے نکلکر مخصوص اصطلاحی معانی میں استعمال ہونے لگتے ہیں تو عرفِ عام میں دوسرے معنے ہی مراد لئے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان الفاظ کے استعمال میں بسا اوقات معانی لغویہ کی طرف ذہن کا انتقال ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ کثرت استعمال کی وجہ سے اصطلاحی معنے ہی متبادر الذہن ہوتے ہیں غایت ما فی الباب یہ کہ لغوی اور اصطلاحی معنوں میں من وجہ مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ جدید عربی الفاظ میں اس کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں۔

"رجعت" ایک جدید عربی اصطلاح ہے اس کے قدیم معنے لوٹنے کے ہیں۔ مگر جدید عربی اصطلاح میں' معاکسۂ عمل (ری ایکشن) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"رسمیؒ" جدید اصطلاح میں" آفیشل" کا مفہوم ادا کرتا ہے
"عَدَمیؒ" قدیم عربی میں" وجودی" کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے
اور موجودہ اصطلاح میں مخالفِ حکومت (انارکسٹ) کو کہتے ہیں۔
اسی طرح عہدِ حاضر کی سینکڑوں اصطلاحات ہیں جن میں قدیم
متروک ہوچکے ہیں عدم تشدد ترک موالات، اشتراکیت اور
اشتمالیت اسی قسم کی سیاسی اصطلاحیں ہیں۔

اسی طرح "قومیت" (نیشنلزم) بھی زمانۂ حال کی سیاسی
اصطلاح ہے جو فرقہ پرستی (کمیونزم) کے مقابلہ میں استعمال
ہوتی ہے بولنے والے اور سننے والے اس سے یہی جدید
معنے مراد لیتے ہیں اب اگر کوئی صاحب اس کے لغوی معنوں
کو سامنے رکھکر لوگوں کو دھوکا دینا چاہے تو یہ نہایت شرمناک
لسانی غلطی ہوگی اور خلط مبحث کا بدترین اسلوب!

موجودہ ارباب سیاست کے بیانات کی روشنی میں متحدہ
قومیت کی تعریف یہ ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی جملہ اقوام کو
ایک ایسی قوم میں تبدیل کرنا جس کا مذہب نام، تمدن، ثقافت

تہذیب و معاشرت اور سیاسی نقطۂ نظر ایک ہو۔ اس لحاظ سے متحدہ قومیت کی تشکیل مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی پر مشتمل ہوگی۔

(۱) اسلام اور ہندو ازم کی خصوصیات کو مٹاکر ایک مشترکہ مذہب کی تعمیر۔

(۲) جداگانہ طریق تمدن، طرزِ معاشرت اور دیگر خصوصیاتِ ملی کو مٹاکر ایک متحدہ تمدن کو بروئے کار لانا۔

(۳) اس جدید قوم کے سیاسی اور اقتصادی نقطہ ہائے نظر اور اغراض و مقاصد میں وحدت و یگانگت پیدا کرنا۔

(۴) اقوام ہند کے ان جداگانہ ناموں کو جن سے وہ آج تک جانی اور پہچانی جاتی ہیں بالکل ختم کردینا اور ان کی جگہ کوئی ایک نام تجویز کرنا۔

کانگریسی مدبّرین کے نزدیک یہ جداگانہ مذاہب قومیت متحدہ کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر اسی وقت عمل میں آئے گی جبکہ ان تمام مذاہب کو مٹادیا جائے گا۔ مگر چونکہ یہ کام کچھ آسان نہیں اس لئے

قومیت کی معراج تک پہنچنے سے قبل درمیانی عرصہ میں مذہب کو کم از کم ایک نجی اور پرائیویٹ حیثیت دے دی جائے گی جس کو ملکی سیاسیات سے کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا.

اسلامی قومیّت

یہ بھی عجیب بات ہے کہ آج ان مسلمات کے لئے بھی دلائل و براہین کی ضرورت پڑ رہی ہے جو ساڑھے تیرہ سو سال سے ملّت اسلامیہ میں مسلم چلے آتے ہیں اور تاریخ اسلامی کے کسی دور میں ان کے متعلق کوئی اختلاف و نزاع پیدا نہیں ہوا کتاب و سنت کی تصریحات اس باب میں اس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ توحید و رسالت کو چھوڑ کر شاید ہی کسی دوسرے اسلامی مسئلہ کے متعلق ہوں: مسلمانوں کی جداگانہ اور مستقل مرکزیت، تنظیم ملّی، جہادِ حریت، اور مخصوص اسلامی تمدن وہ مہتم بالشان اسلامی مسائل ہیں جو اساسِ دین، اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے غیر متزلزل ارکان ہیں، مگر زمانہ کی بوالعجبیوں کا

بھی کچھ ٹھکانہ ہے؟ کہ آج حاملین شریعتِ حقہ نے ہی ان اجماعی مسائل میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

قومیت اور وطنیت کے نظریئے سراسر غیر اسلامی ہیں اور اس پر قرآن و حدیث سے ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اسلام کی نظر میں انسانوں کی تقسیم صرف ایمان و عمل سے ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر بعثتِ سید ولد آدمؐ اور نزولِ قرآن تک تمام انبیاء و رسل کی الہامی تعلیمات میں یہی نظریۂ تقسیم تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اس سے انکار کرنا ایسا ہی ہے کہ عین نصف النہار کے وقت جبکہ سورج اپنی نورانی شعاعوں سے کائنات کے تاریک سے تاریک حصہ ارضی کو بھی منور کر رہا ہو کوئی عقل کا اندھا اٹھکر سورج کے وجود سے ہی انکار کر دے۔ قرآن حکیم کی ابتدائی سطور سے آخر تک خواہ انبیاء سابقین کے تذکرے ہوں یا امم سابقہ کے واقعات، فکری اور نظری مسائل ہوں یا معاشی اور سیاسی قواعد و ضوابط سب میں آپ کو یہی حقیقت ابھری ہوئی نظر

آئے گی کہ انسانوں کی قومیت کی اساس صرف فکری اتحاد پر ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم نے کہیں "الذینَ آمنو" اور "الذین کفروا" کے اعتقادی تقابل سے اس حقیقتِ کبری کو بے نقاب کیا ہے اور کہیں "اصحاب الجنۃ" اور "اصحاب النار" کے مکافاتی تصور سے انسانوں کے دو گروہوں میں حقیقی اور ابدی مغائرت کا اظہار کیا ہے کہیں ان دو گروہوں کو "حزب اللّٰہ" اور "حزب الشیطان" کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور کہیں "خیرالبریّہ" اور "شرالبریّہ" کے نتائج فکر و عمل کو جدا جدا کرکے دکھایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن افراد انسانی میں اس قسم کا ابدی اور حقیقی تضاد ان پر ایک قوم کا اطلاق کسی طرح جائز نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ "حزب اللّٰہ" اور "حزب الشیطان" کو ان کے الگ الگ مسلک و طریق کار اور جداگانہ شعائر ملی کو کالعدم قرار دے کر ایک ہی قومیت میں جذب کر دیا جائے۔ کیا

اس غیر فطری ترکیب سے جو مجموعہ تیار ہوگا وہ قرآن کی نظر میں حزب الشیطان نہیں ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے فکر و عمل کا ایک معین ضابطہ پیش کردیا ہے اور ان کی جدوجہد کے لئے ایک مخصوص شاہراہِ عمل بھی متعین کر دی ہے مسلمانوں کی تنظیم ملی، جہادِ حُریت اور نظام مرکزیت بالکل الگ نوعیت رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو اس امر کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ اپنی رائے اور صوابدید سے اس معین اور مشخص معیار فکر و عمل سے سرِمُو بھی تجاوز کرے۔ اگر ایسا کرنا ممکن ہوتا تو ختم المرسلین صلعم نے اس وقت کیا ہوتا جبکہ ارضِ مکہ کی ساری وسعتیں فرزندانِ توحید کی اس مختصر سی جماعت کے لئے تنگ آچکی تھیں اور قدم قدم پر مصائب و آلام کے پہاڑ سامنے کھڑے تھے۔

ابوجہل، اسود ابن یغوث اور چند دیگر آئمہ کفر آنحضرت صلعم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا اے محمدؐ تم یہ چیخ و پکار کس لئے کر رہے ہو اگر آپ کو دولت و زر کی ضرورت ہے تو خدا کی

قسم ہم آپ کے گھر میں سونے اور چاندی کے انبار لگادیں گے اگر کسی پری پیکر حسینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تم ایکدفعہ اشارہ کردو ہم ارضِ مکّہ کی سب سے بڑی حسینہ عورت آپ کے قدموں میں حاضر کردیں گے اور اگر آپ کو حکومت و سرداری کی ضرورت ہے تو تمام قریش آپ کو اپنا حاکم و سردار تسلیم کریں گے مگر سردار دوجہاں صلعم نے جواب دیا۔ مجھے ان چیزوں میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف آپ کی بہتری اور نجات مطلوب ہے اس پر کفار نے کہا اچھا اگر اور نہیں تو اتنا ضرور کریں کہ ہمارے بتوں کو علانیہ بُرا بھلا نہ کہا کریں اور بت پرستی کی مذمّت نہ کیا کریں۔ ہم آپ سے کوئی تعرض نہ کریں گے آپ شوق سے نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، تلاوت کریں اور اپنے پیروؤں کو وعظ و نصیحت کرتے رہیں اس پر خدائے قدوس کی طرف سے یہ قرآنی آئتیں نازل ہوئیں :-

ان ربّک ھواعلم بمن ضلّ	آپ ان کفار کی کوئی بات تسلیم

عن سبیلہ وھواعلم بالمھتدین فلاتطع المکذبین، ودّوالو تدھن فیدھنون (سورۂ القلم (۲۹))

نہ کریں، یہ چاہتے ہیں کہ کچھ آپ ان کے آگے جھک جائیں اور پھر وہ بھی کچھ جھکنے کو تیار ہیں

اب آپ ابوجہل کے مطالبہ کی آخری مشق پر غور کریں کہ کیا یہ متحدہ قومیت کی دعوت ہی تو نہیں تھی؟ کفارّ مکہّ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ آنحضرت صلعم اپنے مقاصد دینی اور اعلاء کلمۃ الحق میں کچھ تھوڑی سی ملائمیت اور کسی قدر مصالحانہ طرز عمل اختیار کریں تو وہ (قریش) آپ کو متحدہ قومیت کا صدر اعظم (پریذیڈنٹ) تسلیم کرلیں، کفارّ یہ بھی وعدہ کرتے تھے کہ ہم تمھاری نماز، روزہ، تعمیر مساجد اور دیگر مذہبی رسومات کی ادائگی میں حارج نہ ہوں گے، اور تمھارا مذہب، کلچر اور مذہبی رسوم آزاد ہونگی۔ مگر وہ کون سی بات تھی جس کی بناء پر رب قدوس نے آنحضرت صلعم کو سختی سے حکم دیا کہ آپ اپنے نصب العین میں کسی قسم کی مداہنت نہ کریں۔ وہ بات صرف یہ تھی کہ آنحضرت صلعم کے

اتنا تسلیم کر لینے میں اسلام کے معین اور مخصوص طریق فکر و عمل کی موت تھی اگر بالفرض ایسا ہوتا تو مسلمان کا قدم وہیں رک کر رہ جاتا اور جس عظیم الشان مقصد کے لئے سردار دو جہاں صلعم کی بعثت ہوئی تھی اس کی ہرگز تکمیل نہ ہوسکتی

اگر غور کیا جائے تو ابوجہل کی دعوتِ قومیت خداوندانِ کانگریس کی متحدہ قومیت سے بہت نرم تھی یہاں تو جداگانہ مذاہب، اور اقوامِ ہند کے الگ الگ طرزِ تمدن کسی صورت میں برداشت نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایسی ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی جائے گی، جس کے مذہب، آئین سیاست، طریق تمدن اور طرزِ معاشرت میں من کل الوجوہ یکسانیت ہوگی۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

آئندہ صفحات میں ہم نصوص کتاب و سنت اور مستند تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی

نظریۂ اجتماع ایک مستقل بالذات حیثیت رکھتا ہے اور اپنی ہمہ گیر اور محیط کل افادیت کے اعتبار سے تمام انسانوں میں امن و مساوات پیدا کرسکتی ہے۔

اِسلام کا نظامِ اجتماع

کسی نظریہ کے ردوقبول سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے
کہ انسان کی حیات اجتماعیہ پر اس کا کیا اثر پڑسکتا
ہے اور اسے قبول کرنے کے بعد حیات انسانی میں کیا
انقلاب رونما ہوسکتا ہے؟ اس حیثیت سے اسلام کے
فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) اور سماجی نظام پر اگر قناعت
کے ساتھ غور کیا جائے تو یقیناً اعتراف کرنا پڑے گا کہ
یہی ایک جاندار اور مکمل نظریۂ حیات ہے جو خاندانی قبلوی
جغرافی اور نسلی حدبندیوں سے بلندتر ہے اور تمام دنیائے انسانیت
کو اپنے آغوشِ امن میں پناہ دے سکتا ہے اور اسلام کی
دعوت کسی مخصوص گروہِ انسانی یا کسی معین مرزوبوم تک
محدود نہیں بلکہ انسانیتِ مطلقہ کے لئے ہے جس کا مقصد
دنیا کے سارے انسانوں کو ایک عالمگیر رشتۂ اخوت میں

منسلک کرتا ہے۔ اس عالمگیر برادری کا ہر رکن تمام حقوقِ انسانی سے بہرور ہوتا ہے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شہری کو وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو اس کے امیرالمومنین کو حاصل ہیں

دنیا کی کسی قوم کے پاس ایسا کوئی سماجی نظام نہیں جس میں دنیا کے پسماندہ طبقوں کے لئے بھی امن و راحت کا پیغام ہو، اور امیر و غریب، شاہ و گدا، اسود و احمر اور حاکم و محکوم کے لئے ایک ہی قسم کے مجلسی آداب، ایک ہی دستورِ اخلاق ایک ہی طرح کی آزادی فکر اور ایک ہی رنگ کے ملکی، انتظامی اور تعزیری قوانین ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر انسانوں کی بدبختی پر ماتم کرنا چاہیئے کہ انھوں نے اسلام کے اس پیام امن و مساوات کی کوئی قدر نہیں کی اور صدیوں تک انسانوں کے بنائے ہوئے جابرانہ قوانین اور سوسائٹی کے رسم و رواج کے سلاسل و اغلال میں جکڑے رہنے کے باوجود امن و سلامتی کی اس شاہراہ پر نہیں آسکے۔

انسانیت کے ابتدائی دور میں انسان کی تگ و دو صرف

اپنے گھر کی چار دیواری تک ہی محدود تھی، کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لینا ہی اس کی نوعی اور تمدنی ضروریات کا منتہائے نظر تھا مگر آہستہ آہستہ اس انفرادیت کا دور گزر گیا انسانی تعلقات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور ایک خاندان یا قبیلہ کی ایک چھوٹی سی وحدت پیدا ہوگئی اس کے بعد انسان اور بھی ارتقائی منازل طے کرتا گیا یہاں تک کہ خاندانی اور قبیلوی وحدت سے نکل کر اس نے مرز و بوم اور وطن کے تصور پر ایک قومیت کی بنیاد رکھی، غرض ہر زمانہ کے مخصوص ماحول اور وسعتِ علائق کے ساتھ ساتھ اجتماع و تمدن کے دوائر بھی بدلتے رہے مگر اس جغرافی اور رنگ و نسل کی وحدات پر یہ سلسلہ رک گیا اور عالمگیر وحدتِ انسانی تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اور پھر انسانیت کا ہر دور طبقاتی تقسیم سے خالی نہیں رہا، امیر و غریب، شریف و ذلیل، مزدور و سرمایہ دار اور حاکم و محکوم کے ظالمانہ احساسات ہر زمانہ میں برابر اپنا کام کرتے رہے۔

موجودہ اقوام عالم جو حریت و مساوات اور جمہوریت کی علمبردار ہیں۔ آج بھی اس قدیم جاہلی تنگ نظری میں مبتلا ہیں ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک جدید نظام تمدن کی موجد ہیں جس میں ہر انسان شہری حقوق سے بہرہ ور ہے مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں ان کا ہر عمل خود ہی اس کی تردید کر رہا ہے آج بھی غریب و نادار طبقوں کی وہی حالت ہے جو تہذیب و تمدن کے موجودہ دور سے قبل تھی، آج بھی مظلوم انسانیت جبر و قہر کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے اور ان بالادست اقوام کی نظر میں شرافت و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ قوم و وطن اور نظام سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کے تحفظ کے لئے انھوں نے عالم انسانی کو عذاب الیم میں مبتلا کر رکھا ہے۔

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

(اقبالؔ)

اور آج بھی کائنات انسانی جنگ و قتال کے شعلوں کی لپیٹ میں کھڑی ہے۔

ظہر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس (الآیۃ)

مگر دنیا کے انسان اس حقیقت سے جس قدر جلد آگاہ ہوجائیں اتنا ہی بہتر ہوگا کہ اسلام ان کے طبقاتی نظام اجتماع کے علی الرغم تمام عالم انسانی میں حقیقی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہی وہ آخری نظریۂ حیات ہے جس میں امن و راحت کے دواعی موجود ہیں

کتاب و سنت یعنی قرآن اور بانی اسلام صلعم کی مقدس سیرت میں اسلامی فلسفۂ اجتماع کے اصلی خط و خال دیکھے جا سکتے ہیں۔ قرآن حکیم اور بانی اسلام صلعم نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ "رب العلمین" یعنی سارے عالم کا رب ہے نہ کسی خاص فرقہ یا خطۂ ارضی کا۔ محمد عربی صلعم کو تمام نوع انسانی کے لئے نبیٔ رحمت اور بشیر و نذیر ہونے کا عظیم الشان منصب عطا ہوا ہے

وما ارسلناک الّا کافّۃ للناس
لبشیراً و نذیرا۔

ہم نے آپکو اے نبی تمام انسانوں
کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے

اسی طرح قرآن حکیم کی دعوت کسی خاص نسل، قوم اور وطن کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے اور دنیا کا ہر انسان اس کا مخاطب ہے۔

ان ھو الّا ذکر للعالمین
(آیہ)

یہ کتاب تمام عالم انسانی کے لئے
ضابطۂ حیات ہے۔

اس کا ہر قانون جس طرح غریب طبقوں کے لئے ہے اسی طرح اونچے طبقوں یہاں تک کہ خلیفہ و امیر پر بھی حادی ہے اس میں کسی قسم کی لچک، نرمی اور پیچیدگی نہیں کہ آپ اسے اپنی خواہش کے مطابق اِدھر اُدھر پھیر سکیں۔

یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین
بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم
او الوالدین والاقربین
(آیہ)

اے ایمان والو عدل و انصاف کو
قائم رکھو اور صرف اللہ کے لئے
شہادت دو اگرچہ اس میں خود تمھیں
یا تمھارے والدین یا رشتہ داروں

کو نقصان اٹھانا پڑے۔

اُمرت لاعدل بینکم (سورۂ شوریٰ)	مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تم میں (انسانوں میں) انصاف کر دوں۔
عن عبادۃ ابن الصامت رض قال قال رسول اللہ صلعم اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم۔ (اخرجہ ابن ماجۃ۔ کتاب الحدود)	خدائی تعزیرات کا نفاذ اپنوں اور بیگانوں سب پر مساویانہ کرو اور تم کو اللہ کے بارے میں کسی ملامت کا خوف نہیں ہونا چاہیئے۔

اس خدائی کتاب اور محمد عربی صلعم کو ماننے والے لوگ "مومنین" کہلاتے ہیں جن کا مقصدِ زندگی بس اسی قدر ہے کہ امن و مساوات کے اس آخری قانون کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیں کتاب و سنت کی عملی مثال بنکر انسان کو احکم الحاکمین کی حاکمیت کے تحت لا کھڑا کریں اور طبقاتی نظامِ اجتماع کو مٹا کر منشار خداوندی کے مطابق اشیار کی قدریں متعین کریں۔

کُنتم خیر اُمّۃ اُخرجت للناس	مسلمانو! تمھیں ایک بہترین امت

تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون باللہ (آیہ)	بنا کر نوع انسانی کی فلاح ونجات کے لئے بھیجا ہے اور تمھاری بزرگی وبرتری اسی میں ہے کہ تم خیروشر

اور نیک وبد کے اعتبار سے امتیاز کی قدریں متعین کرو اور تمام انسانوں کو ان سے آگاہ کرو۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضۂ حیات ادا کرتے رہو۔

بانیٔ اسلام علیہ التحیۃ و اسلام کی مقدس تعلیم یہی ہے کہ ہمارے نظامِ اجتماع کی بنیاد شرف انسانی اور وحدت فکر پر ہے

کونوا عباداللہ اخوانًا (بخاری)	تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

حدیث نبوی کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کی اخوت کی اساس توحید اور عبودیت ہے۔

اللّٰھمّ ربّنا وربّ کل شیٍٔ انّا شھدنا انّ العباد کلّھم اخوۃٌ	اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب

(اخرجہ احمد، ابوداؤد) | آپس میں بھائی ہیں

رسولِ کریم صلعم کے ان کلمات میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ توحید و رسالت کے بعد اس امر کی شہادت دی گئی ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک ہی قومیت ہیں ظاہر ہے کہ توحید و رسالت اسلام کے "مہات الامور" میں سب سے مقدم درجہ رکھتے ہیں اور اخوتِ انسانی کو ان کے ساتھ ذکر کرنا اور پھر لفظ شہادت سے اِسے موسوم کرنا اس امر کو ظاہر کررہا ہے کہ اخوتِ بشری بھی اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے لہذا کوئی ایسا نظامِ اجتماع جو اس عالمگیر وحدتِ انسانی کے بجائے نسل اور وطن کے تصور پر مبنی ہو وہ اسلام کے نظریۂ اجتماع سے ہر طرح منافی ہے

مگر مشکل یہ ہے کہ اسلام کی دعوت جہاں دنیا کے پسماندہ طبقات کے لئے امن و راحت اور حریت و آزادی کا پیغام ہے وہاں اعلیٰ طبقوں کے لئے پیغام ہلاکت بھی تھا

اس لئے یہ لوگ اسلام کے راستہ میں مزاحم بنتے ہیں۔ اگر کوئی جماعت اس خدائی نظریۂ اجماع کو بروے کار لانا چاہتی ہے تو اسے لازماً سرمایہ دارانہ نظام سے متصادم ہونا پڑتا ہے اور یہ لوگ اپنے وقار ویزی کو خطرہ میں دیکھکر آخری حدتک اپنی قوت و طاقت کا استعمال کرتے ہیں مگر جو جماعت حق و صداقت کی علمبردار ہوتی ہے اور اپنے سینے میں نوعِ انسان کا درد لیکر اٹھتی ہے اُسے ان تمام مراحل سے پوری ہمت کے ساتھ گزرنا پڑتا ہے اور اس راہ میں اُسے ہر قسم کی اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

چو اندلیشم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ (اقبالؒ)

اقوام عالم کی تاریخ کا سب سے تاریک تر اور درد انگیز پہلو انسانوں کی قبائلی، نسلی، لسانی، ثقافتی اور جغرافی تقسیم ہے جس پر ہمیشہ اخوت انسانی کے مقدس رشتہ کو قربان کیا جاتا رہا۔ اور یہ اس ظالمانہ تقسیم کی بنا پر اخلاق و

انسانیت کو ہمیشہ ذلیل و رسوا کیا گیا مگر اسلام کی دعوتِ حقہ کا مقصد یہ ہے کہ عالم انسانی کو ذلّت و غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلا کر حرّیت و مساوات کی نعمت سے مالا مال کر دے۔ ظالم، غاصب اور خود غرض انسانوں کو طاقت و اقتدار کی بلندیوں سے آتار کر اور پسماندہ طبقوں کو ذلّت و رسوائی کے عمیق گڑھے سے اٹھا کر سب کو ایک ہی نقطۂ عدل پر کھڑا کر دیا جائے۔

و انزلنا منهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید)	رسولوں کے ہمراہ ہم نے کتاب اور میزان بھی آتاری تاکہ سب کے سب صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

رسم و رواج کی مصنوعی حد بندیوں کو مٹا کر مخلوق خدا کو ضابطۂ خداوندی کے سامنے جھکا دیا جائے۔

و یَضَعُ عنهم اصرهم و الاغلال التی کانت علیهم۔ (آیہ)	نبی امی صلعم کو اس لئے مبعوث کیا کہ وہ عبودیت و غلامی کے طوق گراں کو ان سے آتار پھینکیں۔

رنگ و نسل اور جغرافی قیود کو ختم کرکے ایمان و عمل اور اخلاق پر شرف انسانی کی بنیادیں استوار کی جائیں۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ	اے لوگو ہم نے تم کو پیدا کیا مرد اور
وجعلناکم شعوباً وقبائل	گروہوں اور نسلوں میں تمھیں
لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ	تقسیم کیا، صرف اس لئے کہ تم
اتقاکم۔ (آیہ)	ایک دوسرے سے پہچانے جاسکو

گمر عظمت و شرف کا معیار اللہ کے یہاں خداترسی
اور عمل و کردار ہے۔

لیس لاحدٍ علی احدٍ فضل	دینداری اور خداترسی کے سوا
الا بدین وتقویٰ (مشکوۃ)	کسی شخص کو کسی پر کوئی وجہِ فضیلت نہیں

اگر پوری دیانتداری کے ساتھ اسلام کے صرف اس ایک باب کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً اسلام کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا اور اس کے لئے دوسرے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ضمن میں پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کی عملی سیرت کو سامنے رکھا جائے کہ انھوں

نے کس طرح نہایت قلیل عرصہ میں زندگی کے ان اہم شعبوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا اور کس طرح قبائلی نسلی اور وطنی جذباتِ عصبیت کو مٹا کر مساوات عمومی سے لوگوں کو روشناس کیا۔

امیّٔ بود کہ از اثرِ حکمت او
واقفِ سرِ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصل ما یک شررِ باختہ رنگے بودہ است
یک نظر کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
(اقبال)

محمد عربی صلعم کی عملی زندگی اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد بھی آپ کی سیرت کا ایک ایک واقعہ امرِ مشاہد کی طرح بیّن اور یقینی ہے احادیث کا وہ ذخیرہ جس کی بنیاد روایت و درایت کے قطعی اصولوں پر رکھی گئی ہے آپ کی زندگی کی ایک ایک حرکت کو پیش کر رہا ہے یہی مقدس سیرت ہمارا دستورِ زندگی ہے اور اسی سے ہماری

قومیت کی تکوین ہوتی ہے امام الہند شاہ ولی اللہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

عربیت نسب عربیت لسان ہر دو فخر ماست کہ مارا بسید الاولین والآخرین وافضل الانبیاء والمرسلین وفخر موجودات علیہ وعلے آلہ التحیۃ والتسلیمات نزدیک می گرداند۔

عربیت نسب اور زبان کے لحاظ سے ہمارے لئے باعث فخر ہے جو ہمیں سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین اور فخر موجودات علیہ السلام سے قریب کرنیوالی ہے

دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں :-

شکر نعمت عظمی آنست کہ بقدر امکاں عادات ورسوم عرب اول کہ منشائے آنحضرت صلعم است از دست نداریم

اس سب سے بڑی نعمت کا شکر ہے کہ ہم نے عرب اول (عہد نبوت) جو آنحضرت صلعم کا منشاء ہے کی عادات ورسوم کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا

اپنی اسی وصیت میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:-

رسوم عجم وعادات ہنود درمیاں خود نہ گزاریم۔ (الفرقان مجدد نمبر)

عجم کی رسموں اور ہنود کی عادات کو ہم اپنے اندر جگہ نہیں دیتے۔

مگر مسلمانوں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے اس مکمل فلسفۂ زندگی سے پہلو تہی کر کے انسانی اصول و نظریات کی پیروی کرنا شروع کر دی کوئی لینن اور کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت کا مداح ہے اور کوئی محمد عربی صلعم کی سیرت کے بجائے گاندھی جی کے بے جان فلسفہ کا پیرو ہے۔ فیا للعجب!

چہ گویمت زمسلمان تا مسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است آزری داند

(اقبالؒ)

حقیقت یہ ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین ملّت ہیں دنیا کو ضرورت ہے کہ ہمارے فلسفۂ اجتماع کی ضیا ریزیوں سے استفادہ کرے نہ کہ ہم اندھا دھند دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیں۔ اعاذنا اللہ منہ،

اسلامی نظریۂ اجتماع کی ہمہ گیر افادیت

اسلام کا نظام اجتماع ان معصوم اور مقدّس اصول و نظریات پر مبنی ہے جو انسان کے ذاتی امیال و عواطف اور اس کے طبقاتی و گروہی جذبات و تخیلات سے بلند تر ہیں یعنی یہ نظامِ حیات اپنی قدرتی بناوٹ کے اعتبار سے کسی انسانی گروہ کے مخصوص عارضی مفادات کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی اصل روح ایک زندہ جاوید اور ابدی حقیقت ہے، اور وہ ہے رب العالمین کی پرخلوص اور مکمل اطاعت! پس اسلام کے پورے نظامِ زندگی میں یہی روح جاری و ساری ہے اور زندگی کا کوئی بعید سے بعید گوشہ بھی اسکے اثر و نفوذ سے خالی نہیں، دستورِ سیاست ہو یا ضابطۂ اخلاق و تہذیب، نظامِ معاشرت و تمدن ہو یا آئین معشیت و اقتصاد غرض اسلامی نظامِ اجتماع کا ہر شعبہ اسی ایک اصل پر مبنی ہے

بلکہ انسان کی انفرادی زندگی کی ہر حرکت بھی اسی نقطۂ مرکز سے وابستہ ہے۔

قُل اِنَّ صلوٰتی ونُسُکِی ومحیایَ ومَمَاتِی لِلّٰہِ رب العالمین لاشریکَ لہ وبذٰلک اُمِرتُ وانا اول المُسْلِمِیْن۔ (آیہ)

اے نبی! آپ اپنی زندگی کا بنیادی اصول ان الفاظ میں واضح کردیں کہ میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب کچھ رب العالمین کے لئے ہے مجھے یہی حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں

چونکہ اس نظریۂ زندگی کا تعلق براہِ راست رب العالمین سے ہے اس لئے اس نظریۂ حیات کو مان لینے کے بعد وہ تمام اختلافات جو جغرافی حدود و ثغور، نسلی، قبیلوی لسانی اور ثقافتی امتیازات کی پیداوار ہیں اور اس عالمی نظریۂ حیات کے راستہ میں حائل ہیں خود ہی ختم ہوجاتے ہیں اور ہزارہا انسانی طبقات (سیکشنز) کے بجائے ایک ہمہ گیر قومیت (انٹرنیشنلزم) بروئے کار آجاتی ہے

اس عالمگیر اخوتِ انسانی میں وجہ جامعیت وہ ازلی اور ابدی حقائق ہیں جو زمانہ کے انقلابات کے باوجود لایتغیر ولایتبدل ہیں اور وہ انسانوں کے وطنی، معاشی اور سیاسی حالات و مقتضیات کے تابع نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی تقاضے ان ابدی حقائق سے وجود حاصل کرتے ہیں اور آخر تک ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کسی فرد یا جماعت کے وقتی تقاضے ان حقائق سے اپنا تعلق منقطع کرلیں

یہ کتنی صاف اور بین حقیقت ہے کہ جس نظریۂ زندگی کی بنا رب العالمین کی ربوبیت عامہ اور انسانیت مطلقہ کی فلاح و بہبود پر ہے کیا وہ کسی مخصوص انسانی گروہ سے امتیازی سلوک کرسکتا ہے؟ علوم اسلامی کا مبتدی بھی اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اسلام انسانوں کو جس معبود حقیقی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ قرآنی الفاظ میں "رب العالمین" ہے اور خدا کا آخری

اور مکمل قانونِ ہدایت وسعادت یعنی قرآن حکیم "ذکر العالمین" ہے اور جس مقدس اور جامعِ صفات شخصیت پر یہ قانونِ خداوندی اتارا گیا ہے وہ "رحمتہ العالمین" ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کیا جائے کہ انسان نے خود ہی اس عالمی نظریۂ حیات کے علی الرغم کائنات انسانی کو سینکڑوں دوائر میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر دائرہ انسانیت ایک مستقل اور جامد قوم (نیشن) بن کر رہ گیا ہے۔ جس کا نظریۂ زندگی اور طرزِ تمدن دوسرے دوائرے سے کلی تضاد رکھتا ہے اور تعصب وتنگ نظری کا یہ حال ہے کہ دنیا کی یہ الگ الگ وحدتیں (یونٹیز) زندگی کے ہر میدان میں باہم دست وگریباں رہتی ہیں مگر اس کی اصل وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟ کہ یہ وطنی، لسانی اور نسلی قومیتیں ہر حیثیت سے باہم متضاد ہیں اور کوئی ہمہ گیر صداقت (یونیورسل ٹروتھ) ان میں وجہ اشتراک نہیں اور ان کے اجتماعی، اور قومی مفادات

کے تصادم نے نسل آدم کو عذاب الیم میں مبتلا کر رکھا ہے۔

موجودہ دورِ اجتماع و تمدن ایک ترقی یافتہ دور تصور کیا جاتا ہے جس کی نظر فریب چمک دمک نے ایک عالم کو محوِ حیرت بنا رکھا ہے اور جمہوریت و مساوات کے کیف آور نغمے ہر سمت سے سنائی دے رہے ہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانوں کی کثیر آبادی زندگی کی تلخیوں سے اس قدر تنگ آچکی ہے کہ وہ زندہ رہنے کی نسبت موت کو ترجیح دیتی ہے آج دنیا کے جمہوری نظامات میں حریّت عامہ اور انسانی مساوات کو پہلا درجہ دیا گیا ہے مگر ان کے اعمال کے پورے نقشے میں کوئی ایک خانہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں حقوق انسانی کے اس ادعائے باطل کو جگہ دی گئی ہو۔

مملکت انگلستان کے بنیادی دستورِ سیاست (کانسٹی ٹیوشن) میں پوری بلند آہنگی سے حقوق انسانی کا

اعلان کیا گیا ہے جسکے رُو سے ملک کے ہر باشندہ کی آزادی فکر اور حریتِ انسانی کا حق تسلیم کیا گیا ہے مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ اعلانات، عملی دنیا میں کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکے چنانچہ شاہی خاندان کے افراد اور افرادِ رعیت میں جو قانونی، مجلسی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں بادشاہ اور اس کے خاندان کے تمام افراد ایک حدتک قانونی بندشوں سے آزاد ہیں کام اور محنت کے بغیر ہی کروڑوں روپے خزانۂ ملکی سے ہر سال حاصل کرتے ہیں گویا ملکی فنڈ ان کی آبائی ملکیت ہے۔ نیز شاہی خاندان کا ہر فرد خواہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو دوسروں پر بہرحال فوقیت رکھتا ہے۔

یہ تو شاہی خاندان کا حال ہے، لیکن عام لوگوں میں بھی عقیدۂ و خیال اور رنگ و نسل کا تعصب جنون کی حدتک پہنچا ہے۔ سفید فام لوگ سیاہ فام لوگوں کے مقابلہ میں معصوم تصور کئے جاتے ہیں اور ان کے لئے یہی تقدس بس کرتا ہے کہ ان کا چہرا سفید ہے اور کالے لوگوں کے لئے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ سیاہ فام پیدا ہوئے ہیں مگر یہ صرف مجلسی اور شہری حقوق تک ہی محدود نہیں بلکہ سیاسی اور

ملکی معاملات میں بھی اسی قسم کا تعصب پایا جاتا ہے اور اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے دستورِ سیاست و اجتماع میں تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں ؎

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

اب جمہوریہ امریکہ کا حال سنیئے! امریکہ میں قریباً سوا کروڑ سیاہ فام حبشی آباد ہیں اور امریکہ کی مجموعی آبادی کے اعتبار سے ان کا تناسب نو فیصدی سے کچھ زائد ہے جہاں تک اس ملک کی دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کے دستورِ اساسی کا تعلق ہے اس میں تمام باشندگانِ ملک بلا لحاظ رنگ و نسل مساویانہ حقوق رکھتے ہیں اور کسی کا حق دوسروں سے فائق نہیں مگر جس وقت ہم عملی دنیا میں اس دستورِ حریت کی مٹی پلید ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بے اختیار رونا آتا ہے کہ ان مدعیانِ حریت و مساوات کے ہاتھوں سیاہ فام انسانوں کی بھاری تعداد کس طرح مشقِ ستم بن رہی ہے، مساوی حقوق تو بڑی بات ہے ان کو تو انسانیت کے ابتدائی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا ہے آج تک کتوں سے بھی ایسا مکروہ سلوک نہیں کیا گیا جو اس مظلوم انسانی آبادی

سے ہو رہا ہے، ان کی عزت و ناموس اور جان و مال سفید فام لوگوں کے ہاتھوں ہر وقت خطرہ میں ہے جس گورے کا جی چاہے، کسی بے گناہ حبشی کو پکڑ کر قتل کر دے، یا کسی معصوم حبشن کی عصمت دری کا ارتکاب کرے، اس کے خلاف قانون کو جنبش تک نہیں ہوتی مگر کوئی حبشی کسی معمولی جرم کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کے لئے قانون کی ساری مشینری حرکت میں آجاتی ہے، مجلسی، تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے ان کو ملیچھ تصور کیا جاتا ہے، ہوٹلوں اور تھیئٹروں میں جانے کی ان کو اجازت نہیں بلکہ کسی حبشی کے لئے گورے کے پہلو میں بیٹھنا بھاری جرم تصور کیا جاتا ہے اور مدارس میں ان کا داخلہ ممنوع ہے، اس لئے کہ ان کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ لوگ تعلیم کے اہل ہی نہیں، بلکہ یہ صرف شرفاء کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

حبشی آبادی کا یہ بڑا جرم ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جائداد کا مالک بن جائے یعنی صاحب بہادر کی نظر میں یہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے جسکی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس غریب کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا جائے۔

روس کے اشتراکی نظام کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے انسانوں کو تمام حقوقِ انسانیت عطا کر دیئے ہیں بلکہ سوشلزم کے پرستار اس نظامِ زندگی کو کائنات انسانی کے لئے نعمت عظمٰی تصوّر کرتے ہیں اور اس کی تعریف و توصیف میں ہر وقت رطب اللسان رہتے ہیں مگر کیا یہ صحیح ہے؟ جہانتک امر واقعہ کا تعلق ہے یہ قطعی غلط ہے کہ اشتراکی نظام نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اُسے ضرورت ہے اور اگر یہ صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کی یہ فیاضنا نہ حکمت عملی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کے ملحدانہ نظریات پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور جو لوگ اس کے لئے تیار نہ ہوں ان کو تہ تیغ یا ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کافی عرصہ سے چل رہی ہے انقلاب فرانس کے بعد امریکہ کی جدوجہد حریت سے ہندوستان کی تحریک آزادی بھی بہت کچھ متاثر ہوئی اور انقلاب روس کی صدائے بازگشت نے اس میں اور بھی قوت پیدا کر دی یہانتک کہ ہندوستان کے ہندو ارباب سیاست تو روس کے انقلاب سے اس قدر متاثر ہوئے

کہ ان کے دل و دماغ میں روسی اشتراکیت کے سوا کوئی چیز سما ہی نہیں سکی اور اب اشتراکیت (سوشلزم) ہی ان کا مذہب بنگیا ہے چنانچہ ان لوگوں کے اعلانات حرّیت پڑھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی آزادی کے فرشتے ہیں جو ہندوستان اور ہندوستانیوں کو آزاد کرانے کے لئے آسمان سے اترے ہیں مگر سخت افسوس ہے کہ وہ اب تک بارہ کروڑ اپنے ہم مذہب بھائیوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق دینے سے بھی قاصر رہے ہیں اور آج بھی دنیا کی یہ مظلوم ترین آبادی ہر قسم کے حقوقِ انسانی سے محروم ہے ان کے یہاں کتّے اور خنزیر سے تو ہمدردانہ سلوک کیا جاسکتا ہے کہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں پاک اور پوتر ہیں مگر ان کے نزدیک یہ غریب انسان کسی شریفانہ سلوک کے مستحق نہیں اور یہ پیدائشی ناپاک اور ملیچھ ہیں اور یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک ہی قوم ہیں، بلکہ گاؤخور مسلمان سے بھی کہا جاتا ہے کہ تم ہمارے بھائی ہو آؤ بھائیوں کی طرح مل کر ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کریں۔ مگر اس کے جواب میں بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ ؎

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن

یہ سب کچھ ان ممالک میں ہو رہا ہے جہاں جمہوری یا نیم جمہوری قسم کی حکومتیں قائم ہیں یا قیام جمہوریت کی جد وجہد کی جا رہی ہے اور جنکے دساتیر باطلہ میں یہ امر بنیادی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ملک و وطن کے تمام باشندے ہر قسم کے شہری حقوق میں مساوی الدرجہ ہیں

کوئی ایسا نظام اجماع جس کی افادیت حدود وطن سے آگے نہ بڑھ سکتی ہو اس میں عالم انسانیت کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ انسانی آبادی کسی ایک وطن ہی میں محدود نہیں بلکہ روئے زمین کی ناپیدا کنار وسعت میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ لاتعداد نسل آدم بھی استحقاق حریت و مساوات کے اعتبار سے ملک کی قدیم ترین آبادی سے کم نہیں ہے۔

اگر اسی تنگ نظری پر اکتفا کی گئی ہوتی تو اسے نظر انداز کرنا بھی ممکن تھا مگر اس سے بھی زیادہ دردناک حقیقت جو ہر ہوشمند انسان کو خون کے آنسو رلاتی ہے یہ ہیکہ ان ممالک کے اصل باشندوں

میں بھی رنگ ونسل اور عقیدہ وخیال کا اسقدر شدید تعصب پایا جاتا ہے کہ اس کے مظاہر مجلسی، معاشی اور دینا بی تفریق و امتیاز کی شکل میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور ان کے ہموطنوں کے وہ طبقے جو بدقسمتی سے برسراقتدار پارٹی کے ہم نسل یا ہم عقیدہ نہیں ہیں ان پر شہری اور انسانی حقوق کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

انسانی مرض کی نوعیت

دنیا کی مادّہ پرست قومیں انسانیت کی بیماری کے علاج کیلئے ایک عرصہ سے مسلسل تگ ودَو کر رہی ہیں اور کسی ایسے اکسیری نسخہ کی طلب وجستجو میں انھوں نے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے جو انسانیت کو زندگی کی تلخیوں سے رہائی دلا سکے مگر حیرت ہے کہ اسقدر جدوجہد کے باوجود ان کو اب تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ انسانیت کا حقیقی دکھ کیا ہے؟ اور اس کے علاج کے لئے کون سے دار الشفا کی جانب رخ کرنا چاہیئے۔

آپ نے فرانس کی تحریک حریت کا منشور آزادی دیکھا ہوگا اور

امریکہ وروس کے اعلانات جمہوریت ومساوات بھی نظر سے گزرے ہوں گے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کی نگاہِ فلک رسا حریت ومساوات کے اس ازلی پیغام کی جانب بھی اٹھی ہوتی جو چھٹی صدی عیسوی میں بو قبیس کی پہاڑیوں سے سنا گیا تھا اور جس نے انسانی دنیا کو ایک حیرت انگیز انقلاب سے روشناس کیا تھا اور انسانیت کی لٹی ہوئی متاع نہ صرف انسانوں کو واپس دلائی بلکہ دنیا کے غریب اور پسماندہ طبقوں کو عزت وشرف کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مادہ پرست دنیا کو یہ توفیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی کے چند لمحے اسلام کے اعلانِ حقوقِ انسانی کے مطالعہ میں بھی صرف کرے

توا ے گردِ تو ہم شوکتِ دریا چہ می دانی
اسیرِ عذرِ تنگی وسعتِ صحرا چہ می دانی

جہاں تک مرض کی نوعیت کا تعلق ہے گذشتہ مباحث میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ موجودہ مصائبِ انسانی کا اصل سرچشمہ اقوامِ حاضرہ کے طبقاتی، نسلی اور عصبیاتی نظریے ہیں جنھوں نے انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے اور جن کی وجہ سے آج کائناتِ

انسانی ایک نہایت بھیانک اور دردناک دورِ مصیبت میں گرفتار ہے یہی وہ حقیقی روگ ہے جو جسم انسانیت کو تیزی کے ساتھ کھائے جارہا ہے مگر انسان کی عقل پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس زہر ہلاہل کو تریاق سمجھ کر خوشی خوشی حلق سے اتار رہا ہے۔

اس مرض کا حقیقی علاج کیا ہے؟

فسادِ انسانیت کی اصلاح کے لئے درحقیقت کسی ایسے نظریۂ حیات کی ضرورت ہے جو ذیل کی صفات کا حامل ہو۔

(۱) جو انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات کا ضامن ہو اور اس میں تمام ابنارِ آدم کا مشترکہ مذہب بننے کی کامل صلاحیت موجود ہو یعنی اس کی بنا ہمہ گیر اور محیط کل اصول و نظریات پر ہو۔

(۲) اپنی جامع اور ہمہ گیر حیثیت کی وجہ سے کسی انسانی گروہ سے امتیازی سلوک نہ کرتا ہو بلکہ تمام ابنار نوع کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہو یعنی جہاں تک انسانیت کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے نسلی شرافت قومی وجاہت اور جغرافی قیود سے قطع نظر تمام انسانوں میں عدل و مساوات قائم رکھ سکتا ہو۔

گذشتہ مباحث میں دنیا کے دوسرے سماجی نظریوں کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظریۂ اجتماع ہی وہ محیط کل اور جامع نظریۂ زندگی ہے جو تمام انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور اسی کی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت (انٹرنیشنلزم) کی تعمیر ہو سکتی ہے یہاں صرف دوسری شق پر سرسری بحث کرنا مقصود ہے کہ اسلام کا نظریۂ اجتماع وتمدن ہی بلا لحاظ رنگ ونسل اور عقیدہ وخیال تمام انسانوں میں مجلسی، معاشی اور قانونی مساوات پیدا کر سکتا ہے۔

معاشرتی مساوات

اسلام کا نظامِ اجتماع وتمدن انسانوں کے کسی گروہ کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں رکھتا بلکہ جہاں تک بنیادی حقوقِ انسانی کا تعلق ہے ان میں نہ صرف یہ کہ مسلمان اور مسلمان میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتا بلکہ مسلم اور غیر مسلم بھی اس کی نظر میں یکساں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظامِ زندگی رب العالمین کی طرف سے انسانوں کے اس مقدس اور منتخب گروہ کو ملا ہے جس کا مقصدِ حیات خدا کی مکمل اطاعت اور انسانیت مطلقہ کی فلاح ونجات ہے یعنی مسلم قومیت دورِ حاضر کی جغرافی

اور نسلی قومیتوں کی طرح کسی قومیت کا نام نہیں بلکہ اس قومیت کی بنیاد چند ہمہ گیر اور مقدس اصول وعقائد پر ہے، اور ان اصولوں کو ماننے کے بعد ہر انسان خواہ لیبیا کا حبشی ہو یا پیرس اور لندن کا مہذب شہری عرب ہو یا عجم اس بین الاقوامی برادری کا معزز رکن بن سکتا ہے جبشہ کے بلالؓ حبشی اور روم کے صہیب رومیؓ دربار رسالت میں شرفاء مکہ سے زیادہ قابل احترام خیال کئے جاتے ہیں اور فارس کے سلمان فارسیؓ کو تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اہل بیت ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے وقت کے باجبروت خلیفہ عمر فاروقؓ حضرت بلالؓ کو اپنا آقا کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور مرتے وقت یہ وصیت فرماتے ہیں کہ میری نماز جنازہ صہیب رومیؓ پڑھائیں گے مگر رسول ہاشمی صلعم کے اپنے ہموطن ——— نہیں بلکہ ہم نسل اور قرابت دار اور اس سے بھی بڑھ کر قریش مکہ کے مقتدر لیڈر ——— ابوجہل کو اس قومیت سے دور کی نسبت بھی نہیں۔

یہ تو مسلم قومیت کی حقیقت ہے مگر انسانیت کے بنیادی حقوق میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں حکومت اسلامی کے ماتحت رہنے

والی جملہ اقوام کو ہر قسم کے شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ غیر مسلموں کے مجلسی اور معاشی حقوق کا پورا احترام کیا جاتا ہے یعنی اسلامی جمہوریت کی افادیت صرف حجاز مقدس یا جزیرۂ عرب ہی تک محدود نہیں بلکہ تمام ابناء آدم اس کی ضیاء باریوں سے مستفید ہوتے ہیں۔

اسلام نے نہ صرف مسلمانوں میں ذات پات اور قبیلہ و نسب کے جاہلی تصوّرات کا خاتمہ کیا اور اعلیٰ و ادنیٰ حیثیت رکھنے والوں کو باہم بھائی بھائی بنا دیا بلکہ غیر مسلموں سے بھی شریفانہ اور مساویانہ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ فقہی قانون بنا دیا ہے کہ

فان قبلوھا فلھم ما للمسلمین و علیھم ما علی المسلمین۔ (ہدایہ کتاب السیر)

اگر وہ جزیہ دینا قبول کرلیں تو وہ ہر قسم کے نفع و نقصان (حقوق انسانی) میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہیں۔

صحابۂ کرام کے زمانہ میں غیر مسلم ذمیوں سے ہر قسم کے معاشرتی، تمدنی اور مجلسی تعلقات رکھے جاتے تھے چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، ایک دفعہ انھوں نے بکری ذبح کی تو گھر والوں سے دریافت فرمایا کہ تم نے اپنے پڑوسی کو گوشت بھیجا ہے؟ کیونکہ میں نے

رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے "کہ مجھ کو جبرئیل نے ہمسایوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ ان کو وارث بنادیا جایگا۔

درحقیقت حسن معاشرت، تمدن کی روح ہے اور اسی سے انسانوں کی باہم رفاقت و محبت کے پُرخلوص جذبات کا پتہ چل سکتا ہے لیکن تاریخ اسلامی گواہ ہے کہ صحابہ کرام کے طرز معاشرت اور حسن معاملہ نے غیر مسلموں کے دلوں میں غیر متزلزل عقیدت پیدا کردی تھی اور وہ ان پر ہر طرح کا اعتماد کرتے تھے۔

حضرت عمر ابن الخطاب نے فتح شام کے بعد ابو عبیدہ ابن الجراح کو ایک فرمان بھیجا جس میں یہ الفاظ بھی تھے۔

وامنع المسلمین من ظلمهم	آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے نقصان
والاضرار بهم واکلهم	پہنچانے اور ان کا مال کھانے سے روکیں
اموالهم واوف لهم بشرطهم	اور تم نے ان کے حقوق کے بارے میں
الذی شرطت لهم فی جمیع	جو شرطیں ان سے طے کی ہیں ان کا پوری
ما أعطيتهم (کتاب الخراج ص۸۲)	طرح ایفا کریں۔

صحابہ کے حسن معاشرت اور بلندی اخلاق ہی کا یہ اثر تھا کہ غیر مسلم

اپنے ہم مذہب عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دست وبازو بن گئے
چنانچہ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں تحریر فرماتے ہیں۔

فلمّا رأى اهل الذمة وفاء المسلمین وحسن السیرة فیهم صاروا اشدّاء علی عدو المسلمین وعوناً للمسلمین علی اعدائهم

جب ذمیوں نے مسلمانوں کا ایفار عہد اور حسن اخلاق دیکھا تو وہ اعدار مسلمین کے مقابلہ میں مسلمانوں کے معاون بن گئے

ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ کی خدمت میں ان لوگوں کا وفد آیا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ مسلمان تم لوگوں کو ایذار تو نہیں دیتے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

مانعلم الّا وفاءً وحُسن ملکة

ہم ان کے متعلق ایفار عہد اور شریفانہ اخلاق کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ (الطبری ص۲۵۶)

مسلمانوں نے جب شام کا علاقہ حمص فتح کیا تو وہاں کچھ عرصہ اپنی چھاؤنی قائم کی اور شہر والوں سے انھوں نے ایک سال کا خراج وصول کرلیا مگر چند ناگزیر حالات کی بنا پر ان کو یہ علاقہ چھوڑنا پڑا، حضرت عمر نے حکم بھیجا کہ ان لوگوں سے جس قدر خراج وصول کیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے کیونکہ یہ خراج ان کی حفاظت کے عوض میں لیا گیا تھا اور اب جبکہ حفاظت نہیں

تو خراج کیسا ؟ مسلمان جب وہاں سے رخصت ہوئے تو وہاں کے عیسائی زار و زار رو رہے تھے اور مسلمانوں سے التجائیں کر رہے تھے کہ خدا کیلئے تم جلدی واپس آنا کہ کہیں رومن عیسائی دوبارہ ہم پر حکومت کرنے کو نہ آپہنچیں اور جب ان کے ہم مذہب عیسائیوں نے دوبارہ ان پر حملہ کیا تو ان لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور ان کو صاف جواب دے دیا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ مسلمانوں کی حکومت تم سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید ند و با تو پیوستند

معاشی مساوات

اسلام کا معاشی نظام اگرچہ ایک مستقل موضوع بحث ہے مگر یہاں اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر بتانا ہے کہ حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا کو جس طرح معاشی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں وہ موجودہ جمہوری حکومتوں میں ان کے ہموطن اور ہم نسل لوگوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

آج دنیا کی حکومتیں خواہ خالص جمہوری (ڈیموکریٹک) ہوں یا دستوری اور پارلیمنٹری ! بر سر اقتدار پارٹیاں اور اشخاص ملک کے خزانہ سے جسطرح

چاہیں خرچ کرتے ہیں اور کروڑوں روپیئے ان کے ذاتی مصارف، پارٹی پراپگنڈے اور دیگر مصالح کی نذر ہو جاتے ہیں اور ملک کے غریب طبقے نہایت مشکل سے گزر اوقات کرتے ہیں مگر اسلام کا خلیفہ خزانۂ ملی سے ایک حبہ تک خرچ نہیں کرسکتا اور معاشی اعتبار سے اسکی حالت ملک کے عام باشندوں کی طرح ہوتی ہے وہ بیت المال سے سال میں کپڑوں کے صرف دو جوڑے اور عام لوگوں کی طرح معمولی خوراک حاصل کرسکتا ہے چنانچہ فاروق اعظمؓ خود اپنے مصارف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

أخبركم بما يستحل لي منه	میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ بیت المال
حلتان حلة في الشتاء وحلة	سے میں کسقدر لے سکتا ہوں؛ دو جوڑے
في القيظ وما احج عليه واعتمر من	کپڑے ایک سردیوں اور دوسرا گرمیوں کیلئے
الظهر وقوتي وقوت اهلي كقوت	ایک سواری جس پر میں حج اور عمرہ کرسکوں
رجل من قريش لا باغناهم ولا	اور قریش کے متوسط الحال آدمی کی طرح
بافقرهم ثم انا بعد ذالك رجل من	میرا اور میرے اہل وعیال کا کھانا۔ اس
المسلمين يصيبني ما اصابهم	کے بعد عام مسلمانوں کا ایک فرد ہوں
(ابن سعد ج ۳ ص ۱۹۸)	اور ہر بات میں ان کا شریک حال ہوں

خلافت اسلامی میں کسی شخص کو بھوکا اور تنگدست نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ ہر مذہب و ملت کے معذور، ناتواں اور غیر مستطیع لوگوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ایک اہم شق یہ تھی۔

ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابہ آفۃ من الآفات او کان غنیاً فافتقر واصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ، وعیل من بیت مال المسلمین وعیالہٗ	جو بوڑھا شخص کام اور محنت سے معذور ہو جائے یا اس کا جسم ماؤف ہو جائے یا وہ مالدار تھا اور اب غریب ہو گیا ہے کہ اسکے ہم مذہب اُسے غریب سمجھکر اس پر صدقہ و خیرات کرنے لگے ہیں تو اسکا جزیہ معاف کر دیا جائیگا اور اسکی اور اسکے اہل و عیال کی پرورش بیت المال کے ذمہ ہو گی۔

(کتاب الخراج صفحہ ۸۵)

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک حاکم کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی کرو۔ ان میں جو ضعیف العمر یا نادار ہو جائے اسکی کفالت کرو۔

خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو تجارت کی کھلی آزادی تھی

بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کے تجارتی ٹیکس میں تخفیف کردی گئی چنانچہ شام کے قبطی اپنا مال تجارت مدینہ میں لاتے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کا محصول نصف کر دیا تھا۔

سیاسی اور ملکی حقوق

غیر مسلم رعایا کو باقاعدہ ملکی امور میں حصہ دار بنانا اسلام ہی کی خصوصیت ہے موجودہ حکومتیں اپنی ہموطن اور ہمقوم اقلیتوں کو ہر قسم کے اقتدارِ حکومت سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور ملک کی جس پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے وہ دوسری پارٹیوں کو ہر طرح کچلنے اور سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے ان کو کمزور بنانے کی ہر ممکن جدوجہد کی جاتی ہے مگر عہد خلافت راشدہ میں ذمیوں کو بڑے بڑے ذمہ دارانہ عہدے تفویض کئے گئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی کو جس کا نام ابو زبید تھا عامل مقرر کیا حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی کو تعلیم دے کر اپنا میر منشی بنایا اور امیر معاویہؓ نے ابن آثال کو جو ایک نصرانی تھا حمص کا کلکٹر مقرر کیا

مذہبی آزادی

خلافت اسلامیہ میں غیر مسلم رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی

اوقاتِ نماز کے علاوہ ان کو ہر وقت اجازت تھی کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہبی مراسم ادا کریں۔

علی ان یضربوا نواقیسھم فی ایّ ساعۃ شاؤا من لیل او نھارٍ الا فی اوقات الصلوٰۃ	وہ نماز کے اوقات کے سوا ہر وقت ناقوس بجا سکیں گے۔

(کتاب الخراج)

حضرت عمرؓ نے اپنے عیسائی غلام کو اسلام کی دعوت دی مگر اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا: لا اکراہ فی الدین دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں اور وفات کے وقت اُسے گلے لگایا اور فرمایا تم جہاں جی چاہے جا سکتے ہو

قانونی مساوات

دنیا کے کسی نظامِ حکومت میں یہ بات نظر نہیں آئیگی کہ بلا لحاظ عقیدہ و خیال اور بلا تمیز رنگ و نسل تمام انسانوں پر ایک ہی قانون حاوی ہو اور کوئی بڑے سے بڑا انسان یہانتک کہ ملک کا سب سے بڑا حکمران بھی قانون کی گرفت سے مستثنیٰ نہ ہو یہ خصوصیت بھی اسلام ہی میں آپ کو ملے گی کہ مسلمانوں کا خلیفہ بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو وہ اُسی سزا کا مستوجب ہوگا جو کسی معمولی سے معمولی شہری کو دی جاتی ہے۔

حضرت معاذ ابن جبلؓ کو روم کے دربار میں بطورِ سفیر بھیجا گیا اور وہ بے دھڑک رومی سردار کے طاغوتی تخت کے پاس جا بیٹھے ان کے اس طرزِ عمل پر شاہی حاشیہ برداروں نے اعتراض کیا، اس کے جواب میں آپ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ زمانۂ حاضر کے پرستارانِ جمہوریت و مساوات کے لئے سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتے ہیں۔

امیرنا رجل منّا ان عمل فینا	ہمارا امیر ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر وہ ہمارے
بکتابِ دیننا وسنۃ نبیّنا قدّرناہ	دین کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت پر
علینا وان عملِ بغیر ذالك	عمل کرے تو ہم اُسے خلافت کا اہل تصور
عزلناہ عنّا وان ھو سرق قطعنا	کرتے ہیں ورنہ اُسے معزول کردیتے ہیں
یَدَہ وان زنا جلدناہُ وان	اور اگر وہ چوری کرے تو ہم اسکا ہاتھ کاٹ
شَتَمَ رجلاً منّا شتمہٗ، بما	ڈالتے ہیں اگر وہ زنا کرے تو اسکو سنگسار کرتے
شتمہٗ وان جرحہٗ اقادہ من	ہیں اگر وہ ہم میں سے کسی کو گالی دے تو اُسے
نفسہ لایحتجب منّا ولایتکبّر	گالی کا گالی سے جواب دیا جاتا ہے اگر وہ کسی کو
علینا ولا یستأثر علینا فی فیئنا	زخمی کردے تو اسے اس کا بدلہ دینا پڑتا ہے
الذی افاءہ اللہ علینا و	وہ ہم سے چھپ کر ایوانِ شاہی میں بیٹھا

وھو کو حبلٍ منا۔ نہ وہ تکبر کرتا ہے اور نہ وہ مال غنیمت میں اپنی

ذات کو ترجیح دیسکتا ہے وہ ہماری طرح کا

(فتوح الشام ص۱۰۵) ایک آدمی ہے۔

چنانچہ عہد خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں اور ذمیوں میں ایک جیسا سلوک کیا جاتا رہا۔ ایکدفعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک یہودی قتل کر دیا گیا حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو فرمایا میرے دورِ خلافت میں اس طرح انسانوں کا خون ہو! میں تمھیں خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ جسے قاتل کا علم ہو مجھے بتائے!

ایکدفعہ حیرہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؓ نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالے کر دیا جائے چنانچہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے اُسے قتل کر دیا۔

بلکہ شاہی خاندان کے افراد اور ذمیوں سے برابر کا سلوک کیا جاتا تھا چنانچہ ہشام ابن عبدالملک نے ایک عیسائی کے خلاف مقدمہ دائر کیا حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے ان دونوں کو برابر کھڑا کیا ہشام نے شاہی غرور میں عیسائی کو سخت کلمے کہدیئے تو عمر ثانیؓ نے اس کو سختی سے ڈانٹا اور سزا کی دھمکی دی۔

اسلام میں غیر مسلم ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے برابر قرار دیگئی ہے

ان ابابکرؓ و عمرؓ کانا یجعلان دیۃ الیھودی والنصرانی اذا کان معاھدین دیۃ الحر المسلم۔ (دارقطنی کتاب الحدود)	حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ یہودی اور نصرانی اہل الذمہ کی دیت، آزاد مسلمان کے برابر قرار دیتے تھے۔
قال علیؓ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا و دیتہ کدیتنا۔ (رواہ الدارقطنی فی سننہ)	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ذمیوں کا خون ہمارے خون کے برابر ہے (قصاص میں) اور ان کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔

ان حقائق سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا نظام اجتماع وسیاست کس طرح انسانوں میں عملی مساوات پیدا کرتا ہے، اور وہ کسی ایک گروہ سے محض سیاسی یا مذہبی عقیدہ کے اختلاف اور رنگ و نسل کی تمیز اور جغرافی قیود کی بنا پر کسی قسم کی نا انصافی کا برتاؤ نہیں کرتا بلکہ اس کے پیش نظر انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے۔

اسلامی اجتماع و تمدن کے چند اہم اجزاء

اسلام کا جہادِ ملّی

اسلام کی نظر میں وطن اور رنگ ونسل کا رشتہ حقیقی رشتہ نہیں جو مسلمان کو جنگ کے لئے آمادہ کر سکے بلکہ اسلام نے مسلمانانِ عالم میں ایک مضبوط، پائدار اور حقیقی رشتہ قائم کر دیا ہے اور وہ ہے ایمان وعمل! اسی رشتہ میں مسلمان کیلئے کشش وجاذبیت ہے اور اسی کی خاطر وہ سربکف رہتا ہے۔ ہاں! اسلام سے قبل اقوام عالم اپنے مخصوص وطنی، ملکی اور قبیلوی مفاد کے تحفظ کیلئے لڑتی تھیں اونچے طبقے کے لوگ اپنے اقتدار کے نشے میں کروڑوں مظلوم، بیکس انسانوں کی تمناؤں کو موت کی آغوش میں سلا دیتے تھے نسل وقبیلہ کی عظمت وبرتری اور خاندانی وجاہت ان کی جدوجہد کا نقطۂ مرکز تھی۔ اور اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نسلی اور قبیلوی مفاد کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے تھے جو اخلاق وانسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہو سکتا ہے مگر اسلام نے آکر اس ظالمانہ طرزِ فکر وعمل کو یکسر بدل دیا اور انسانوں کی جدوجہد کے لئے صرف ایک ہی مرکز قرار دیا۔

قاتلوا حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ

(آیہ)

مسلمانو تم اسوقت تک لڑتے رہو جبتک کہ دنیا سے شر و بدعت کا فتنہ مٹ نہ جائے اور دین (طاعت) صرف اللہ کیلئے مخصوص ہو جائے

عن ابی موسیٰ قال جاء رجل النبی صلعم فقال یا رسول اللہ فان احدنا یقاتل غضباً و یقاتل حمیۃ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ

(بخاری)

ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی ذاتی عناد و بغض کیلئے اور کوئی نسلی عصبیت کیلئے لڑتا ہے فرمایا کہ صرف کلمۂ حق کی سربلندی کیلئے لڑنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے

عن سعید ابن جبیرؓ قال خرج علینا عبد اللہ بن عمرؓ فرجونا ان یحدثنا حدیثاً حسناً فبادرنا الیہ رجل فقال یا ابا عبد الرحمٰن حدثنا عن القتال فی الفتنۃ واللہ یقول و قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ فقال ھل تدری ما الفتنۃ ثکلتک

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ کوئی اچھی حدیث بیان فرمائینگے ہم میں سے ایک آدمی آگے بڑھا اور عرض کیا اے عبد الرحمٰن قتال فی الفتنہ کے متعلق ہم سے کوئی حدیث بیان کیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "تم یہاں تک جہاد کرو کہ فتنہ مٹ جائے" عبد اللہ ابن عمرؓ نے

املک انما کان محمد صلی اللہ علیہ	فرمایا تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم یقاتل المشرکین وکان	مشرکین سے جہاد و قتال کرتے تھے تو اسلئے کہ
الدخول فی دینھم فتنۃً ولیس	مشرکین کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا اور
کقتالکم علی الملک	وہ تمھاری طرح ملک و وطن کی خاطر نہیں
(بخاری کتاب الفتن)	لڑتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ، نسل، قوم اور وطن زمانۂ جاہلیت کے وہ اصنام باطلہ ہیں جن کو زمانۂ رسالت کے جانباز مسلمانوں نے چور چور کر دیا تھا مگر یہ زمانہ کی نیرنگیاں ہیں کہ جن بتانِ آذری کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ریزہ ریزہ کیا تھا آج ان کے آگے ہمارا ہی سرِ نیاز خم ہو رہا ہے۔

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستد مومن و کافر تراشد (اقبال)

اس سلسلہ میں عہد نبوت کا صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ میں "قزمان" نامی ایک شخص تھا جسکی نسبت سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے۔ یہی شخص غزوۂ احد میں نہایت قوت سے لڑ کر شدید زخمی ہوا، مسلمانوں کو حضورؐ کے ارشاد پر بہت تعجب ہوا کہ جو شخص اتنی بہادری

سے لڑکر زخمی ہوا ہے وہ دوزخی کیسے ہوسکتا ہے؟ انھوں نے اس شخص کے پاس جاکر کہا کہ تجھے مبارک ہو کہ تو اللہ کے راستہ میں شہید ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا، میں اور کسی چیز کو نہیں جانتا مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ مدینہ والوں کی مکّہ والوں سے لڑائی ہے اور غیرتِ وطنی نے مجھے مدینہ والوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ اس پر صحابہؓ کو ارشادِ نبوی کی نسبت یقین آگیا کہ یہ شخص واقعی جہنّمی ہے

دنیا کی دوسری اقوام سے بحث نہیں کہ ان کے دواعی عروج اور اسباب ترقی کیا ہیں؟ ہر قوم کی اپنی تاریخ، اپنی روایات اور جداگانہ قومی مزاج ہے مگر مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ جن مخصوص اجزاء فکر و عمل سے بنتی ہے ان کی طلب و جستجو ہی ہماری مشکلات کا واحد حل ہے اس سلسلہ میں کتاب و سنت اور قرنِ اول کی قومی جدوجہد کے سارے اسباق کو ازبر کرنے کی ضرورت ہے اور پھر اس عہد کا تعین بھی لازمی ہے جہاں سے ہماری حیات ملّی میں اختلال رونما ہوا جسے ہم مبدأ فساد سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس عہد سے لے کر اب تک جسقدر مفاسد ہماری اجتماعی زندگی میں رونما ہوچکے ہیں ان کی صحیح تشخیص کے بعد ہماری جدوجہد کا آغاز بالکل ملّت کی تعمیر اول کے نہج و اسلوب پر ہونا چاہئے لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا سلمانوں کے دورِ آخر کی اصلاح اُسی فکر و عمل

سے ہوسکتی ہے جس سے دورِ اوّل کے ہما صلح اوّ لہا۔

مسلمانوں کی اصلاح ہوئی۔ (انس ؓ)

مگر ماضی قریب میں اسلامی فکر کی جگہ فکرِ فرنگی نے لے لی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلامی کو قدم قدم پرنا کامی ونامرادی سے دوچار ہونا پڑا اور اب مسلسل ناکامیوں کے بعد انھیں بھولا ہوا سبق یاد آنے لگا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی دنیا کے حالات نہایت تیزی سے بدلتے جارہے ہیں اور خدا نے چاہا تو وہ دن دور نہیں کہ ملت اسلامیہ اپنے عزائم ملّی میں کامیاب ہو کر رہے گی۔

"پھر ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور"

تنظیم ملّی کی اساس

آجتک مسلمانوں کی تنظیم کے لئے جتنی راہیں اختیار کی گئیں وہ اسلامی نظریۂ اجتماع کے سراسر منافی تھیں اسلام کسی ایسی تنظیم کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا جس کی بنیاد قبیلہ، خاندان، نسل اور وطن ہو۔ یا اس کا ڈھانچہ اسلام اور کفر کی غیر فطری ترکیب سے بنا ہو۔

مسلم اور غیر مسلم کے اغراض ومقاصد اور سیاسی نقطۂ نظر میں زمین وآسمان

کا فرق ہے مسلمان آزادی اس لئے چاہتا ہے کہ خدا کی زمین میں خدائی نظریۂ اجتماع کا نفاذ کرے اور دوسری اقوام کی جدوجہد آزادی کا مقصد یہ ہے کہ انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملے ملک کے افلاس کا خاتمہ ہو جائے یا زیادہ سے زیادہ اقتدارِ حکومت بدیشی ہاتھوں سے اہل وطن کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جن دو قوموں کے طرزِ فکر اور سیاسی نقطۂ نظر میں اتنا تضاد موجود ہو ان کو کسی ایک جماعتی نظام میں کس طرح جکڑا جا سکتا ہے ؟

مسلمانوں کو قبیلوی، نسلی اور وطنی عصبیت کی بنیادوں پر منظم کرنا دورِ جاہلیت کی بدترین لعنت ہے، جسے اسلام نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا مگر مسلمانوں نے از سرِ نو اس جاہلی تصوّر کو اپنی اجتماعی زندگی میں داخل کر لیا ہے اور عہدِ فتن کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک برابر اس بت کی پرستش ہو رہی ہے۔

عہدِ نبوت میں مسلمانوں کی تنظیم خالص فکرِ اسلامی پر ہوئی، کبھی ہاشمی، غیر ہاشمی، عرب غیر عرب کا سوال نہیں کھڑا کیا اور کسی فرد یا جماعت کی طرف سے یہ سوال اٹھا بھی تو اس کو اسی وقت دبا دیا گیا۔

غزوۂ حنین کے بعد تقسیم اموال کے سلسلہ میں انصار کے کچھ نوجوانوں

نے کہدیا کہ ہماری تلواروں سے ابتک قریش کا خون خشک نہیں ہوا مگر تقسیم متاع میں ہمارا حصہ بھی قریش کو دیا جا رہا ہے۔

ان سیوفنا لتنقطر من دماء قریش
وغنائمنا تردّ علیھم۔ بخاری

یہ بات کسی طرح رسول ہاشمی صلعم کے کانوں میں جا پہنچی۔ اس پر انصار کو طلب کیا گیا اور حضورؐ نے دریافت فرمایا کیا تم نے یہ بات کہی ہے؟ مگر انصار کی گردنیں مارے شرم کے جھک رہی تھیں' کہا یا رسول اللہ آپ نے جو کچھ سنا وہ درست ہے اس پر آپ نے ایک دل ہلا دینے والا خطبہ ارشاد فرمایا جس کے ایک ایک لفظ نے آگ پر پانی کا کام دیا۔ آخر میں آپ نے فرمایا "تمھارے لئے یہ کافی نہیں کہ دوسرے سونا اور چاندی لے کر گھروں کو واپس جائیں اور تم اللہ کے رسول کو ساتھ لیجاؤ؟ اس پر انصار فرط مسرت سے کود پڑے اور یہ نعرہ لگایا" رضینا باللہ ربا و بمحمدؐ نبیا۔

غزوۂ بنی المصطلق میں ابن سعید غفاری (جو حضرت عمرؓ کا اجیر تھا) اور سنان الجہنی (جو عبداللہ ابن سلول کا حلیف تھا) میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا غفاری نے جہنی کی کمر پر گھونسا دے مارا۔ اس پر اس نے مدینہ والوں کو

پکارا اور غفاری نے مہاجرین سے امداد طلب کی اور غصے کی حالت میں یہ بھول گئے کہ اسلام نے مکی اور مدنی کا تفرقہ مٹا دیا ہے آنحضرت صلعم نے جب "یاللا انصار" اور "یا للمہاجرین" غیر مانوس آواز سنی تو فرمایا۔

مابال دعوی جاھلیۃ یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ایک مہاجر نے ایک انصار کو پیٹا ہے۔ تو اس پر حضور نے ارشاد فرمایا

دعوھا فانھا منتنۃ اوخبیثۃ — اس نعرہ کو چھوڑ دو کہ یہ نہایت ناپاک یا خبیث نعرہ ہے۔ (بخاری)

ترمذی شریف اور دیگر کتب حدیث میں آیا ہے کہ عبداللہ ابن سلول کو ایک سنہری موقعہ ہاتھ آ گیا اور اس نے انصار کو وطن اور نسل کے نام پر ابھارنا چاہا۔ کہا یہ لوگ ہمارے ٹکڑوں سے پلے ہیں اور آج ہمارے ہی مقابلہ پر اُتر آئے ہیں؟ تم آئندہ کے لئے ان کو کچھ نہ دینا کہ خود ہی بھوک سے تنگ آ کر مدینہ سے بھاگ جائیں گے۔

ھم الذین یقولون لاتنفقوا علی من عند رسول اللہ حتیٰ ینفضوا۔ — یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں رسول اللہ کے ساتھیوں کو کوئی چیز نہ دو کہ وہ خود ہی یہاں سے بھاگ جائیں

اور پھر اس بدبخت نے یہاں تک کہدیا کہ

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجنّ الاعزّ منھا الاذلّ (منافقون) — جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو ہمارے معزز لوگ ان ذلیل لوگوں کو باہر نکالیں گے

رئیس المنافقین کی یہ باتیں حضرت زید ابن ارقم نے سنیں اور حرف بحرف اپنے چچا سے آکر کہدیں اور چچا نے حضور کی خدمت میں عرض کیں اس پر آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن سلول کو طلب فرمایا حضرت عمرؓ پاس کھڑے تھے، عرض کیا یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو اس بدبخت کی گردن اڑادوں؟ اب عبداللہ نے قسم کھاکر انکار کردیا، نبی کریمؐ نے اس کی قسم کی تصدیق فرمائی مگر جب زید ابن ارقم کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضور نے عبداللہ کو سچا مان لیا ہے تو ان کو بہت صدمہ ہوا ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ ساری عمر میں مجھے اتنا رنج کبھی نہیں ہوا جتنا کہ اس بات سے ہوا کیونکہ اس معاملے میں وہ جھوٹے قرار دیئے گئے تھے اور صحابہؓ جھوٹ کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے چنانچہ جب مدینہ واپس آئے تو گھر کی چاردیواری میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کئی دن تک شرم کے مارے باہر قدم نہ رکھا یہاں تک کہ خدائے قدوس نے خود انکی تصدیق کی اور منافقین کے مکروفریب کو عیاں کردیا

"ترمذی" کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ابن سلول کے بیٹے عبداللہ کو جو سچے مسلمان تھے جب یہ معلوم ہوا تو تلوار سونت لی اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہا خدا کی قسم جب تک تم یہ الفاظ واپس نہ لو گے یعنی اپنے آپ کو ذلیل اور محمد رسول اللہؐ کو معزز نہیں کہو گے میں تمھیں مدینہ میں داخل نہ ہونے دوں گا چنانچہ اس نے ایسا کہا اور پھر رسول اللہؐ کی اجازت سے اِسے مدینہ میں داخل ہونے دیا گیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ وطنی، قبیلوی، اور نسلی عصبیت کی بنیادوں پر مسلمانوں کی تنظیم کسی حال میں جائز نہیں، اور ان کی تنظیم صرف اسلام کی اساس پر ہی ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے کسی شخص کو اس کی ماں کا طعنہ دیا تو آنحضرت صلعم سُنکر سخت رنجیدہ خاطر ہو گئے اور فرمایا

انک امرؤ فیک جاھلیۃ (بخاری) تجھ میں ابتک جاہلیت کی بو باقی ہے

اسی طرح صدیقِ اکبرؓ نے کہیں ایسی ہی بات کہدی تو آپ نے فرمایا۔

اوفعلت وانت صدیق (بخاری) صدیق ہو کر ایسی بات؟

اسلام کا تصورِ آزادی

جب آزادی کا لفظ بولا جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ ہندوستان کا ہر باشندہ اس لفظ سے ایک ہی مفہوم مراد لے ایک لفظِ آزادی کی کیا خصوصیت ہے ہر ایسی اصطلاح کے محل استعمال اور مواقع صدق میں غیر معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً عدم تشدد، ترک موالات اور اس قسم کی تمام جدید اصطلاحات میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر دوسری اقوام سے بالکل مختلف ہے مسلم غیر مسلم سوال سے قطع نظر غیر مسلم اقوام کے افراد بھی ان الفاظ کے معنی و مصداق پر متفق نہیں۔

ترک موالات کی اصطلاح دراصل، قرآنی آیات سے ماخوذ ہے اسلئے اس کے مصداق کے تعین کیلئے قرآنی نظریۂ اجماع کے ماتحت ہی ایک دائرہ عمل متعین کیا جاسکتا ہے اور غیر مسلم اقوام اس کے استعمال میں قرآنی حدود کی پابند نہیں ہوسکتیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک جزوی تصور دونوں قوموں میں مابہ الاشتراک ہوسکتا ہے جو ان میں کامل اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح آزادی کے منشاء و مصداق میں مسلم اور غیر مسلم بالکل

جداگانہ نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں۔ ہاں آزادی کا وہ مفہوم جو بادی النظر طریق پر سمجھا جاتا ہے یعنی استخلاص وطن یا خالص وطنی حکومت کا قیام۔ تو یہ محض سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے کافی ہو سکتا ہے درحقیقت آزادی اپنے منشار کے اعتبار سے اس سطحی مفہوم سے بہت بلند ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ غیر ملکی حکومت کا اخراج یا قومی و ملکی حکومت (نیشنل اسٹیٹ) کا قیام ہی مقصود بالذات ہے یا یہ اصل مقصد کے لئے محض وسیلہ ہے اور منتہائے مقصود کوئی دوسری چیز ہے یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کے سمجھنے سے تمام فرقہ وارانہ نزاعات ایک ہی دن میں ختم ہو سکتے ہیں۔

غیر مسلموں کا مفہوم آزادی

کانگریس یا ہندو قوم نے آزادی کا ایک گھٹیا سا مفہوم متعین کر لیا ہے جو اقوام مغرب کے تصورِ آزادی کا عکس ہے' اور اب وہ تمام اقوام ہند پر اس مہمل تصورِ آزادی کو ٹھونسنا چاہتی ہے اور بد قسمتی سے کچھ مسلم ارباب سیاست بھی اس میدان میں کانگریس کے شانہ بہ شانہ دوڑے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے ذہن و دماغ بھی اس سطحی آزادی سے آگے کسی منزل کا مشاہدہ نہیں کرتے اس لئے وہ اسی کو آخری منزل قرار دے رہے ہیں

ہندو کے نزدیک آزادی کا تصور صرف یہ ہے کہ ملک کی زمام اختیار و اقتدار غیر ملکی ہاتھوں سے نکلکر اہل ملک کے ہاتھوں میں آجائے مرکز میں ایک وحدانی قسم کی حکومت قائم ہوجائے جس میں اقلیتوں (میناریٹیز) کو تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی حاصل ہو مگر اصل اقتدار حکومت ملک کی اکثریت (مجارٹی) کو حاصل ہو۔ اکثریت و اغلبیت کے تمام فیصلے قانون بن کر اقلیتوں کی گردن پر مسلط ہوں ملک کی پیداوار باہر نہ جائے ہندوستانیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کیلئے کپڑا میسر آسکے بس کانگریس کے نزدیک آزادی کی آخری منزل یہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آزادی کو حقیقی آزادی کا نام دیا جاسکتا ہے؟ اس سے قطع نظر کہ یہ آزادی صرف ہندو قوم کی آزادی ہوگی اور دوسری قومیں حکومت کے حقیقی اقتدار سے قطعی طور پر محروم ہوں گی۔ بالفرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ہندو اور مسلمان کو مرکز میں مساوی اختیار حاصل ہو تو بھی یہ آزادی حقیقی آزادی نہیں ہوسکتی، تاوقتیکہ ملک کی تمام قوموں کے فکر و ذہن، ضمیر اور مذہب کی مکمل آزادی کا تحقق نہو ظاہر ہے کہ ہر قوم کی فکری اور ذہنی آزادی حقیقی صرف اس صورت

میں متحقق ہو سکتی ہے کہ اس کے لئے بالکل آزاد، خود مختار اور جداگانہ مرکز
اور ایسا ماحول ہو جو اس کے طبعی مقتضیات سے مناسبت تامہ رکھتا ہو۔
کسی مخلوط سنٹر میں یہ مناسبت کسی صورت میں متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ
مسلمانوں کے طبعی مقتضیات اور ہنود کے فطری دواعی میں کلی تضاد ہے۔
جب تک ان متضاد عناصر ترکیبی میں کسر یعنی شکست و ریخت کا عمل نہ
کیا جائے اس وقت تک کسی صورت میں یہ ترکیب طبعی ترکیب نہیں
کہلا سکتی اور ہر عنصر کو اگر اس کی مخصوص طبیعت پر رکھنا منظور ہے تو
اس کے لئے بالکل الگ مقام و موقف تجویز کرنا ہوگا۔

مسلمان کی آزادی

مسلمان اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کے اعتبار سے ایک مستقل بالذات
قومی تشخص رکھتے ہیں اور ان کے اس اجتماعی وجود کے مخصوص تقاضے ہیں
جن کی تکمیل صرف مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ کوئی دوسری قومیت و
جنسیت اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے اِس سے کسی قسم کا مستقل تعاون
یا اتحاد نہیں کر سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے مستقل وجود اور امتیازی خصوصیات
کو مٹا کر مسلمانوں کی وحدتِ عمومی میں شامل نہ ہو جائے اور نہ ہی

اسلامی وحدت کسی دوسری جنبیت کو اپنے اندر لینے کی مجاز ہے اور مسلم قوم بھی اپنے شعائر خصوصی کے ساتھ کسی دوسری قوم کا جزو نہیں بن سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے اجتماعی مقتضیات کو ترک نہ کردے اور جب یہ اپنے اجتماعی تشخص کو چھوڑ دیگی تو اس کے ساتھ ہی اِسے مسلم کا لیبل بھی ترک کرنا ہوگا اور اپنے لئے کوئی دوسرا لیبل تجویز کرنا پڑیگا۔ کیونکہ مسلم کا نام اسی وقت تک اس پر صادق آسکتا ہے۔ جب تک یہ اپنی مخصوص ہئیت ملی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی	اے ایمان والو مکمل طور پر اسلام میں
السلم کافۃً ولا تتّبعوا خطوات	داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم
الشیطان (آیۃ)	پر ہرگز نہ چلو۔

اسلامی نظریۂ حیات میں ربط و تسلسل قائم رکھنا اور زندگی کے تمام زاویہ پر ان کو منطبق کرنا مسلمان کا ملّی شعار ہے اسی سے اس کے اجتماعی وجود کو بقاء حاصل ہے اس سے قطع نظر کرنے کے بعد مسلم کا کوئی وجود متحقق نہیں۔

اسلام میں تنظیم (آرگنائزیشن) کے اصول و مبادی، جہاد

حریت کے لوازم، معاشی نقطہ ہائے نظر اور سیاسی نظریے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل جدا ہیں اور کسی دوسری قوم کے نظریہ ہائے اجتماع و تمدن کو ان سے کوئی نسبت نہیں لہذا مسلمان کی مطلوبہ آزادی وہی ہو سکتی ہے جو متذکرہ امور کی جامع ہو۔ دوسری اقوام کے تنظیمی، اقتصادی اور سیاسی نظریے اسلامی نظریۂ حیات کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

راحت مشرقۃً ورحت مغرباً

شتّان بین مشرق و مغرّب

جو چیز ہندو قوم کے پولیٹکل جدوجہد کا آخری نقطہ بن سکتی ہے وہ مسلمان کے جولانِ قدم کی ابتدائی منزل ہے، ان کی انتہا ایک محدود خطۂ ارضی میں رہنے والوں کے چند مادی تقاضوں کی تکمیل ہے اور ہماری انتہا تمام کرۂ ارضی میں قرآنی نظام فکر و عمل کا قیام و نفاذ ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر پڑے گا اسی کو قبلۂ مقصود تصور کر لیا مگر اپنے نورِ بصیرت سے کائناتِ عالم کو منور کرنے والا مردِ مومن راستے کے سنگ میل کو کبھی منزل مقصود نہیں تصور کر سکتا۔

آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است　　دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ زخاک

لہٰذا ایسی ترکیب نہ صرف غیر مفید بلکہ سخت مضر ہو گی جو ان مختلف الخامیت عناصر پر مشتمل ہو ایک شخص مشرق کی جانب بڑھ رہا ہے اور دوسرا مغرب کی طرف سرپٹ دوڑ رہا ہے تو کوئی ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ دونوں شخص آپس میں کسی مقام پر بغلگیر ہونگے۔ جن دو قوموں کی راہِ عمل جدا جدا اور منزلِ مقصود الگ الگ ہے ان کی رفاقت کیسے ممکن ہو سکتی ہے لہٰذا ہر قوم کا فطری اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مستقل "واحدہ" کی حیثیت سے اپنے اجتماعی اور ملّی مقتضیات کی تکمیل کرے۔ اس مقصد کے لئے اسے آزاد ماحول اور مستقل بالذات مرکز کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنی مخصوص ہیئت اجتماعیہ کو ہر حال میں برقرار رکھیں دینی اور ملّی تقاضوں کو پورا کریں اور اسلام کے فلسفۂ اجتماع، ضابطۂ اخلاق و تمدن، نظامِ اقتصاد معیشت اور دستورِ سیاست کا اس کی اصل شکل میں نفاذ کریں، اسی صورت میں مسلم قوم کی حقیقی آزادی متصور ہو سکتی ہے اور اس کے سوا جو آزادی ہو گی وہ اسلام اور مسلم کی آزادی نہیں، دین و مذہب اور روح و ضمیر کی آزادی نہیں بلکہ محض ملک و وطن کی آزادی ہے جو مسلمان کے لئے ہرگز مقصود بالذات

نہیں مسلمان آزادیٔ وطن کو اپنی جد و جہد کا مرکز قرار نہیں دے سکتا
رنگ و نسل اور قبیلوی عصبیت اس کو جہاد و قتال پر آمادہ نہیں کر سکتی
اس کو جنگ کے لئے ابھارنے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے
خدا کے مقدس دین کی سربلندی اور فتنہ و شر کا استیصال!

صرف خدا کی محبت میں تلوار اٹھانے والا مردِ غازی وطنیت
اور قومیت کو ہرگز کعبۂ مقصود نہیں بنا سکتا اور اس کا دل صرف جلال
خداوندی کا نشیمن ہے اس لئے وہ خدائے قہار کے سوا کسی بڑی
سے بڑی چیز کے سامنے بھی اپنا سرِ نیاز خم نہیں کرتا

اُمِرْتُ اَنْ اُسلم لرب العٰلمین۔

استقلالِ مرکز

توحید و رسالت کی طرح یہ بات بھی آج تک مسلم چلی آتی ہے
کہ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جداگانہ اور مستقل بالذات مرکز کی
ضرورت ہے یعنی کسی سرزمین میں مسلمان تھوڑی سے تھوڑی تعداد
میں ہیں یا بھاری اکثریت میں، ان کو قوتِ مقتدرہ حاصل ہے یا نہیں
بہرصورت ان کی مرکزیت الگ رہے گی نیز مسلمانوں کی جو جماعت

اقتدار ملکی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے وہ جد وجہد کی عبوری منزلوں میں بھی بالکل الگ اور مستقل مرکز کے ماتحت اپنی تگ ودو جاری رکھے گی کیونکہ آج جو جماعت اقتدار حکومت کے لئے سعی کررہی ہے کل وہی مسندِ اقتدار پر متمکن ہوگی اور ابتک جو مرکزیت حصول اقتدار کا ذریعہ ہے آئندہ چل کر وہی اقتدارِ حاکمیت کی مالک ہوگی۔

یہ اسلامی مرکزیت جو احکم الحاکمین کے اقتدار اعلیٰ کی تابع ہے کسی دوسری انسانی مرکزیت کے لئے متبوع تو بن سکتی ہے لیکن تابع نہیں بن سکتی اور نہ ہی مساویانہ رنگ میں کسی ایسے مرکز سے تعاون کرسکتی ہے۔ کیونکہ موخر الذکر دونوں صورتیں غلبۂ کفر پر منتج ہوتی ہیں اور مسلمانوں کے جہاد ملّی کا مقصد اعلیٰ غلبہ کفر (فتنہ) کو ختم کرنا ہے۔

قاتلوا حتیٰ لاتکون فتنۃٌ ویکون الدین کلہ للّٰہ (آیہ)	مسلمانو! تم اسوقت تک جہاد کرتے جاؤ جتنک کہ فتنہ (غلبۂ شرک) ختم ہو اور اطاعت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے

آنحضرت صلعم اور صحابہ کبارؓ نے "فتنہ" کے مفہوم کو خود متعین فرمادیا ہے۔

انما کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل المشرکین وکان الدخول فی دینہم فتنۃً ولیس کقتالکم علی الملک (بخاری)	آنحضرت صلعم مشرکین سے جہاد اسی لئے کرتے تھے کہ ان کے دین میں داخل ہونا (غلبۂ کفر و شرک) فتنہ تھا اور وہ تمھاری طرح ملک کی خاطر نہیں لڑتے تھے۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "شرح سیر کبیر" کی ایک عبارت کے ضمن میں لکھا ہے۔

> کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہو اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہوں یا دونوں برابر ہوں، تو شرکت جائز نہیں، جس کی وجہ بھی اسی (مذکورہ بالا) روایت ہی میں مذکور ہے کہ شرکت میں اندیشہ یہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جائے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

اب اگر مسلمان اسی غیر مسلم طالب آزادی جماعت (کانگریس) کے ساتھ شریک ہو جائیں تو یقیناً وہ مسلمانوں کے تابع نہیں ہیں بلکہ یا تو متبوع ہوں گے اور مسلمان ان کے تابع اور غالب ہی ہیں۔

اور یا دونوں برابر ہوں گے تو گویا یہ احتمال بہت ضعیف ہے لیکن
اگر ایسا ہو بھی تب بھی جوازِ شرکت کی جو شرط تھی کہ مسلمان
متبوع ہوں وہ مفقود ہے، اس لئے جواز بھی مفقود ہے اور
جو وجہ عدم شرکت کی روایت مذکورہ میں بیان کی گئی ہے
کہ مسلمانوں سے کام نکال کر پھر خود مسلمانوں پر غالب آنے
کی کوشش کریں یہاں اس کا خطرہ یقینی ہے

(اشرف السوانح حصہ سوم صـ۲۰۲)

یہ تو ہے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ! مگر اس سے قطع نظر
یہ اسلام کی ایسی بیّن حقیقت ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے قطعاً کسی
استدلال کی ضرورت نہیں مگر ہماری بدبختی کی بھی حد ہوگئی ہے کہ آج
ہمیں شریعتِ حقہ کے بدیہی اور مسلمہ مسائل کے لئے بھی دلائل و براہین
کی ضرورت پڑ رہی ہے

بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے (اقبال)

زمانۂ رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں کوئی ایک بھی ایسی

مثال نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے بدرجۂ اقل مساوی حیثیت سے ہی غیر مسلموں سے اشتراک عمل کیا ہو، اگر کیا ہے، تو صرف متبوع کی حیثیت سے! اس سلسلہ میں کتاب وسنت سے بے شمار شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر یہ ایک مستقل بحث ہے، اور کسی آئندہ فرصت میں ہم اسے چھیڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بہرحال مسلمانوں کا مخصوص نظام مرکزیت ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسری مرکزیت کو اسلامی مرکزیت پر مسلط کردیں یا دوسری مرکزیت سے جوڑ توڑ کرکے کوئی درمیانی راستہ تجویز کریں بلکہ ان کو ہر حال میں ایک ایسے الگ اور مستقل مرکز کے ماتحت رہنا لازمی ہے جو اسلامی نظام مرکزیت کا تابع ہو۔

اسلامی نظام مرکزیت ان ہی خصوصیات کے اعتبار سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے اور یہ ایک مستقل موضوعِ بحث ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس لئے چند اشارات پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اس باب میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لئے مرکز اطاعت کا تعین ہو، اس بارے میں قرآنِ کریم کی نص قطعی موجود ہے

کہ مسلمانوں کا مرکز اطاعت خدا، رسول اور امیر ہے

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ — اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول اور تم میں سے ہی جو امیر ہو اس کی اطاعت کرو

"امر" کا لفظ بالعموم کتاب وسنت میں حکومت و اقتدار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً "انا لا نولی ھذا الامر" اور "ان لا ننازع الامر اھلہ" اور اس طرح کی بیشمار احادیث میں امر کے یہی معنی لئے گئے ہیں اس لئے "اولی الامر" سے مراد خلیفہ و امیر ہی ہو سکتا ہے اگرچہ بالتبع آئمہ و مجتہدین بھی اس میں شامل ہیں۔

امام بخاری نے تمذکرہ بالا آیت کو باب کا عنوان قرار دیا ہے اور اس کے ماتحت یہ روایت درج کی ہے

من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من اطاع امیری فقد اطاعنی۔ — جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی

روایت کے مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت دراصل

خدا اور رسول کی اطاعت ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ایک مستقل مرکز ہو جو رب العالمین کے اقتدار اعلیٰ کا تابع ہو کسی غیر اسلامی مرکز میں یہ خصوصیت قطعاً نہیں پائی جا سکتی۔

اطاعت امیر کے بارے میں اس کثرت سے احادیث و آثار ملتے ہیں کہ توحید و رسالت کو چھوڑ کر کسی دوسرے دینی مسئلہ کے متعلق آپ کو ہرگز نہیں ملیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت ملّی کے تحفظ و لبقا کے لئے خلیفہ و امیر کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ فکر و عمل کا اتحاد اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جبکہ پوری جماعت کا ایک ہی مرکزِ اطاعت ہو اور افرادِ جماعت دوائر ملکیہ کی طرح اپنے نقطۂ مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں، فکر و خیال میں اتحاد و تسلسل ہو اور عملی جد و جہد میں نظم و انضباط ہر قدم پر پوری ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ اٹھے۔

امیر کا وجود دراصل ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ پوری قوم، دشمن کے حملہ و ہجوم سے محفوظ رہتی ہے یہی فلسفۂ جماعت محمد عربی صلعم کے بلیغ کلام میں ملتا ہے۔

انما الامام جُنّۃٌ یقاتل من ورائہٖ ویُتّقٰی بہٖ۔

امام یا امیر ایک ڈھال ہے جس کی پناہ لیکر جہاد وقتال کیا جاتا ہے۔

(از حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۲۶)

جماعت میں نظری اور فکری اتحاد کے علاوہ اس کا ہر عمل بندھا اور سمٹا ہوا ہونا چاہیئے اور اس میں کسی قسم کا انتشار نہ ہو، بالکل ایسا معلوم ہو کہ جماعت کے افراد ایک ہی جسم کے اعضا ہیں یا ایک ہی تنے کی شاخیں، پھول اور پتے ہیں جو بہارِ زندگی سے ہمکنار ہو رہے ہیں

ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

دل ودماغ الگ الگ ہوتے ہوئے طریقِ فکر ایک ہو۔ آنکھیں جدا جدا رکھنے کے باوجود طرزِ نگاہ میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

چیست ملّت اےکہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ (اقبال)

اسلامی زندگی بس جماعتی زندگی کا ہی دوسرا نام ہے اور انفرادیت حیاتِ جاہلی کی مرادف ہے۔

عن ابن عباسؓ من رأی من امیرہ شیئاً یکرھہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ فیموت الا مات میتۃً جاھلیۃً۔ (متفق علیہ)

جو شخص امیر سے کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھے تو اسے صبر کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص جماعت سے الگ ہو کر مرا اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

دائرہ اطاعت

اطاعت امیر کے سلسلہ میں ایک اہم بحث کی تنقیح بھی ضروری ہے کہ اس باب میں مسلمانوں نے اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ اسلام کے صحیح تصورِ اطاعت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، بالخصوص ہندوستان کے نازیت زدہ اشخاص نے اطاعت امیر کی اصل سپرٹ کو سمجھا ہی نہیں جس کیوجہ سے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

دراصل اسلام میں اطاعت امیر ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسلام نے جہاں پوری زندگی کی حدیں متعین کر دی ہیں وہاں اطاعت کو بھی ایک خاص دائرہ عمل میں محدود کر دیا ہے لہذا اس مذہبی فریضہ کی تکمیل کتاب وسنت کے متعین حدود کے

اندر ہی ہو سکتی ہے۔ اور مسلمان ہر چیز کے حسن و قبح کو اسی عینک سے دیکھتا ہے اس لئے اس کا ہر قدم اسلام کے حدود کے اندر رہ کر ہی اٹھ سکتا ہے اور امیر کا حکم بھی اسی پابندی کے ساتھ سنا اور مانا جا سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ امیر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے اور مسلمان اندھا دھند اسے اطاعت امیر تصور کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے اور خدا اور رسول کے نزدیک مجرم قرار پائے۔

اس باب میں اسلام کا واضح حکم یہ ہے کہ کسی ایسی بات میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

لا طاعة لمخلوقٍ فی معصیة الخالق

لہذا اسلام میں اطاعت کا لزوم صرف ان احکام تک ہی محدود ہے جو کتاب و سنت سے متصادم نہ ہوں جو لوگ اسلامی تعلیمات کی اصل روح کو سمجھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اسلام میں سب سے اہم فرض امر بالمعروف ہے جو کسی حال

نظر انداز نہیں ہوسکتا۔ اس کی تائید میں عہد نبوت کے بہت سے واقعات کتب صحاح سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے اسلامی فوج کا ایک دستہ خالد ابن ولید کی سرکردگی میں بنی جذیمہ کی طرف بھیجا انھوں نے جاکر اس قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے قبول دعوت سے انکار کر دیا' اب خالدؓ نے کچھ لوگوں کو قتل کیا اور دوسروں کو گرفتار کرکے اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا اور اس کے بعد حکم دیا کہ تم اپنے اپنے اسیر کو قتل کر دو' اس پر عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا' واللہ میں تو اپنے قیدی کو ہرگز قتل نہ کروں گا اور نہ ہی میرے ساتھی یہ حرکت کرنے کو تیار ہیں۔ واپسی پر یہ معاملہ سردارِ دوجہاں صلعم کے حضور میں پیش ہوا۔ آپ نے سُن کر ارشاد فرمایا

اللھم انی ابرء الیک مما صنع خالدؓ (بخاری کتاب الغزوات) اے خدا میں خالد کے اس فعل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔

رسول خدا صلعم نے ایک انصاری کی قیادت میں فوج کا

ایک دستہ روانہ کیا اور حکم دیا کہ امیر کی اطاعت کرنا۔ اس دستۂ فوج نے منزل مقصود کی طرف رُخ کیا سفر کے کسی مرحلہ پر امیر کسی بات سے ناراض ہوگیا اور اپنی سپاہ کو ان الفاظ سے مخاطب کیا "کیا رسول اللہ صلعم نے تمھیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا" ؟ سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا "ہاں" کہا تم سب لکڑیاں جمع کرو، لکڑیاں اکٹھی کردی گئیں تو حکم دیا کہ ان کو آگ لگادو۔ آگ بھی لگادی گئی تو کہا اس میں چھلانگ لگاؤ اس پر بہت سے لوگ آگ میں کود پڑنے کو بھی تیار ہوگئے، مگر ان میں ایسے اصحاب بھی موجود تھے جو اسلام کے تصورِ اطاعت کو سمجھتے تھے، انھوں نے کہا ہم نے اس آگ سے بچنے کیلئے ہی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا ہے، ہم ایسا ہرگز نہ کرینگے جب آنحضرتؐ تک یہ بات پہنچی تو فرمایا "اگر تم لوگ آگ میں چھلانگ لگاتے تو قیامت تک اس سے نہ نکل سکتے" اور فرمایا کہ الطاعة فی المعروف (بخاری) | اطاعت صرف نیک کام میں ہی ہوسکتی ہے

تمت